برِّصغیر کے حکمرانوں کے خلاف لڑنا
مسلمانوں پر کیوں واجب ہے؟

تالیف
مُفتی فَضل الرحمٰن قاسمی

نوائے غزوۂ ہند
مطبوعات

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ

نامِ کتاب	برِّ صغیر کے حکمرانوں کے خلاف لڑنا مسلمانوں پر کیوں واجب ہے؟
مصنف کا نام	مولانا فضل الرحمٰن قاسمی
تاریخِ اشاعت	۷ ربیع الاول ۱۴۴۶ھ / ۱۰ ستمبر ۲۰۲۴ء
ناشر	ادارہ نوائے غزوۂ ہند
برقی پتہ برائے رابطہ	editor@nghmag.com

برِّ صغیر کے حکمرانوں کے خلاف لڑنا

مسلمانوں پر کیوں واجب ہے؟

مولانا فضل الرحمٰن قاسمی

نوائے غزوۂ ہند
مطبوعات

فہرست

حرفِ اوّل ۸

ابتدائیہ ۱۰

برِّصغیر کیوں دار الحرب بنا اور اب بھی کیوں دار الحرب ہے؟ ۲۰

کتاب کا مسئلہ ۲۰

ہندوستان کی حالت ۲۶

''اس شہر میں مسلمانوں کے امام کا حکم ہر گز جاری نہیں، نصاریٰ کے حکام کا حکم و دبدبہ جاری ہے'' ۲۷

''اور جرائم کی سزا کے مقدمات میں کفار کا حکم جاری ہو، اگر چہ بعض احکامِ اسلام مثلاً جمعہ و عیدین اور اذان اور گائے کے ذبیحہ میں کفار تعرض نہ کریں'' ۲۸

برِّصغیر ہندوستان اب بھی کیوں دار الحرب ہے؟ ۳۰

بھارت ۳۰

بنگلہ دیش ۳۰

پاکستان ۳۲

دار الحرب ہونے کے اعتبار سے پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان فرق ۳۳

ہندوستان: دار الحرب بننے سے ماضی قریب تک ۳۶

علمائے ہند کا کردار ۳۶

ہم پر کیا گزری؟ ۳۶

پہلا حصہ: فتویٰ دار الحرب سے مغل سلطنت کے خاتمے تک (۱۸۰۸ء تا ۱۸۵۷ء) ۳۸

ناقابل ذکر اختلافات رکچھ الحاد کچھ زلات ۳۹
ادائے فرض کا ایک قابلِ اقتداء نمونہ ۴۰
بانیان دارالعلوم دیوبند کا اقدام ۴۱
نزہۃ الخواطر پر ایک نظر ۴۳
خلاصہ ۴۴
دوسرا حصہ: مغل سلطنت کے خاتمے سے آزادئ ہند اور قیام پاکستان تک (۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء) ۴۵
رہبران امت کی سرگرمیاں ۴۶
ایک ناقابل انکار حقیقت ۴۷
جہاد شاملی کے بعد ۴۸
شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی ۴۸
شیخ الہند کا طریق کار ۴۹
نزہۃ الخواطر کا بیان ۵۰
غدار اور منافقین ہر جگہ ہوتے ہیں ۵۳
تاریخ کے مذکورہ حصے سے ہمارا تعلق ہے ۵۴
جمہوریت کی بدبو اور اس کا اثر ۵۵
ایک الم ناک حقیقت ۵۵
مشائخ اسلام اور سیاسی لیڈر ۵۶
خلاصہ ۵۷

ایک اور حقیقت کا انکشاف ۵۸

آزادئ ہند اور قیام پاکستان سے لے کر تقسیم پاکستان اور قیام بنگلہ دیش تک (۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۱ء) ۵۹

تقسیم پاکستان اور قیام بنگلہ دیش سے لے کر اب تک (۱۹۷۱ء تا حال) ۶۱

پاکستان کے شریعہ بینچ سے کوئی دھوکہ نہ کھائے ۶۳

تاریخ کے چند صفحات پر نظر ڈالنے کے بعد ۶۴

ہماری کمزوری ۶۴

ہماری ذمہ داری کیا ہے؟ ۶۸

پہلی ذمہ داری: عدو صائل اور ان کے نائبین سے مغصوبہ دارالاسلام آزاد کرانا ۶۸

دوسری ذمہ داری: کافر اور مرتد حکمرانوں کو حکومت سے ہٹانے کے لیے جہاد کرنا ۷۲

تیسری ذمہ داری: اقامت خلافت اور امارت اسلامیہ کا قیام ۷۹

قرآن کیا کہتا ہے؟ ۷۹

حدیث کی رہنمائی ۸۱

فقہ واجتہاد کا فیصلہ ۸۶

خلاصہ ۹۳

ایک مرتبہ پھر نظر ڈالیں ۹۴

جہاد ایک اجتماعی عمل ۹۵

ہماری کمزوری اور عذر ۹۶

حرفِ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ، أما بعد!

انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں وراثتِ خیر القرون کے امین، حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند اور اپنے زمانے کے امام، حضرت مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے، 'ہندوستان یا برِّ صغیر کے دار الحرب' ہونے کا مشہورِ زمانہ فتویٰ جاری فرمایا۔ اس فتوے کا بنیادی سبب احکامِ شریعت کا برِّ صغیر میں معطل ہو جانا تھا، وہ احکامِ شریعت جن کے اجرا کے سبب صدیوں برِّ صغیر دار الاسلام رہا اور اسی دار الاسلام برِّ صغیر میں عالمی طور پر مسلمان حکام میں نابغہ حیثیت رکھنے والے سلطانِ عادل علامہ اورنگ زیب عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیت بھی تختِ سلطانی پر متمکن رہی جب دریائے آمو سے خلیج بنگال تک شریعتِ محمدی (علی صاحبہا ألف صلاۃ وسلام) نافذ تھی۔ پس جب شریعت اقتدار کے ایوانوں اور عدالتوں سے عملاً مفقود ہو گئی، تو جس خطے کی حیثیت دار الاسلام کی تھی وہ تبدیل ہو کر دار الحرب قرار پائی۔ اور اس دار الحرب کو دوبارہ دار الاسلام میں تبدیل کرنے کے لیے جہد و جہاد مسلمانوں پر واجب ہو گیا۔ اسی دار الاسلام کے قیام کی کوشش میں سیّد احمد شہید اور مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمہا اللہ کی قیادت میں 'تحریکِ مجاہدین' برپا ہوئی، صادق پور و دہلی کے علماء نے اپنا خون پیش کیا، اسی دفاعِ ارضِ مسلمین اور اقامتِ دار الاسلام کی خاطر شاملی کا میدان سجا اور دار العلوم دیوبند جس کو اکابر علماء نے کئی مواقع پر 'جہادی تیاری کے لیے چھاؤنی' کہا، کا قیام ہوا۔ اسی دار العلوم کے پہلے شاگرد مجاہدِ کبیر شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نے عالمی تحریکِ ریشمی رومال چلائی۔

برِّ صغیر کو دار الحرب سے دار الاسلام میں بدلنے کا فریضہ آج بھی ہماری جانوں پر انفرادی حیثیت میں اور اجتماعی حیثیت میں اسی طرح متوجہ ہے جیسا کہ انیسویں صدی عیسوی کے پہلے عشرے میں تھا اور جس کی خاطر بالاکوٹ و شاملی کے میدان اور کبھی مالٹا کے جیل خانے سجائے گئے۔ ہمارے بزرگ و محترم و مکرم ساتھی حضرت مولانا مفتی فضل الرحمٰن قاسمی صاحب (دامت برکاتہم العالیۃ) کی زیرِ نظر تالیف اسی فرضِ عین کا شرعی و تاریخی بیان ہے۔ یہ

مختصر کتاب ’برِّ صغیر کے حکمرانوں کے خلاف لڑنا مسلمانوں پر کیوں واجب ہے؟‘ مجلّہ نوائے غزوۂ ہند میں قسط وار شائع ہو چکی ہے اور اب اس کی اقساط کو موضوع کی اہمیت اور افادۂ عام کے لیے یکجا کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔

مولانا مفتی فضل الرحمٰن قاسمی صاحب کا تعلق شہید سراج الدولہ، سید تیتو میر اور حاجی شریعت اللّٰہ رحمۃ اللہ علیہم کی سرزمین سے ہے جس کے مشرقی حصے کو آج بنگلہ دیش کے نام سے جانا جاتا ہے، مولانا موصوف نے کتابِ ہٰذا کو بنگلہ دیش میں ہی قلم بند کیا ہے۔

اللّٰہ پاک اس کتاب کو قبول و مقبول فرمائیں، جہاد فی سبیل اللّٰہ کی توفیق امت کے خواص و عوام کو عطا فرمائیں، برِّ صغیر سمیت تمام مسلم خِطّوں کے دوبارہ ’دار الاسلام‘ بننے کو بحال فرمائیں جس کی آخری اور اعلیٰ صورت دنیا میں خلافت علی منہاج النبوۃ کا قیام ہو، جب اللّٰہ اور اس کے رسول صلی اللّٰہ علیہ وسلم کا دین تمام ادیان، تمام اقوام اور تمام سرزمینوں پر غالب ہو، آمین یا ربّ العالمین!

وصلی اللہ تعالیٰ علی النبی، وآخر دعوانا أن الحمد للہ ربّ العالمین.

مدیر

ادارہ ’نوائے غزوۂ ہند‘

۶ ربیع الاول ۱۴۴۶ھ / ۹ ستمبر ۲۰۲۴ء

☆☆☆☆☆

ابتدائیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی، أما بعد

اسلامی دنیا اور مسلمانوں کے غالب طبقے کے موجودہ حالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے لیے یہ بات تسلیم کرلی اور اپنی قسمت کے لیے یہ طے کر بیٹھے ہیں کہ وہ آئندہ کبھی دنیا اور اہلِ دنیا کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں نہیں تھامیں گے جو اس دنیا کے سفر کی ابتدا سے انہیں کے ہاتھ میں تھی۔

انہوں نے اپنی تمام ذمہ داریاں ان لوگوں کے حوالے کردی ہیں جو ان کے معبودِ حقیقی یعنی اللہ کے دشمن ہیں، ان کی جان سے محبوب اللہ کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہیں، تمام مسلمانوں کے دشمن ہیں، خود ان کے جانی ومالی دشمن ہیں اور ساری موجودات وکائنات کے دشمن ہیں۔ وہ اپنی ذمہ داریاں خود سنبھالنے کی ہمت بالکل کھو چکے ہیں، چاہے وہ ذمہ داری اپنے معبودِ حق کی وحدانیت کی تائید واثبات کے بارے میں ہو، اپنے طرزِ حکمرانی میں ہو، اپنے قوانینِ زندگی کے بارے میں ہو، یا اپنی ذاتی، عائلی اور سوسائٹی کی بول چال اور شب وروز کے چھوٹے بڑے ہر قول وفعل کے بارے میں ہو۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ، مسلمانوں کے عقیدے "معبودِ حق ایک اللہ تعالیٰ ہے اس کا کوئی شریک نہیں" کو کسی رام یا کسی مسٹر سے منظور کروانا ہوگا، مسلمان اپنے ملک اور اپنی عدالتیں کس آئین اور کس قانون سے چلائیں گے یہ قرآن، حدیث اور فقہ اسلامی کے بجائے غیر مسلم سربراہوں سے پوچھنا اور ان سے سیکھنا پڑے گا، کوئی مسلمان اپنی شخصی اور عائلی زندگی میں کس طرزِ عمل پر زندگی بسر کرے گا یہ اللہ کے کسی دشمن سے پوچھنا پڑے گا، کوئی مسلمان اگر اپنی بیوی کو تین طلاق دے کر اس کو زندگی کے لیے اپنے اوپر حرام کرلے تو اس حرام بیوی کے ساتھ باقی زندگی گزارنی پڑے گی یا نہیں یہ فتویٰ کسی ہندو سے لینا پڑے گا، مسلمان لڑکے کی کسی لڑکی سے قربت کے لیے شادی ضروری ہے یا نہیں یہ فتویٰ بھی کسی عیسائی یا کسی ایسے شخص سے طلب کرنا ہوگا جو اس کائنات کے لیے نہ کسی خالق کو مانتا ہے اور نہ وہ اس دنیا کے فنا ہوجانے کے بعد کسی زندگی کا قائل ہے۔

آج کی دنیا میں یہ باتیں کوئی خیالی اور احتمالی چیز نہیں، یا یہ کسی مایوس اور لاچار آدمی کا خوابِ بد نہیں، بلکہ یہ روز مرہ کی حقیقت ہے اور صبح و شام کا واقعہ ہے۔ البتہ احساس اور نظرِ عبرت کا حال اتنا ہی مختلف ہے کہ، ان حالات سے دوچار ہو کر کسی کی نیند تک حرام ہو گئی ہے، منہ کا ذائقہ تک خراب ہو گیا ہے، چین کی زندگی عرصے سے مفقود ہے اور اس کے بر خلاف کسی کی بے فکری اور خوشی کا عالم ایسا ہے کہ، صبح و شام کی سیر و تفریح اور دن رات کی آسائش و زیبائشِ عمر کی فکر میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں پڑا۔ اور اس آسمان و زمین جیسے فرق کے مابین ہم جیسوں کے اتنے درجے ہیں کہ جن کی کوئی انتہا نہیں۔

حالت یہاں تک جا پہنچی کہ قطعی اور واضح فرائض شبہات اور خیالات شمار کیے جا رہے ہیں، روزانہ کی ضروریاتِ دینیہ کو بے فائدہ کہا جا رہا ہے، صبح و شام کے واجبات کو بے ثمرہ اور بے نتیجہ قرار دیا جا رہا ہے، قرآن، حدیث اور فقہِ اسلامی کے حوالوں کو غیر علمیت اور سطحیت سے تعبیر کیا جا رہا ہے، نقدِ علمی کو سوئے ادب و بد تمیزی کا عنوان دیا جا رہا ہے۔

ان حالات سے متاثر ہو کر اور گھبرا کر اہلِ قلم اور اہلِ فکر حالاتِ حاضرہ کے بعض خاص مسائل میں اپنے قلم اٹھاتے ہوئے بے حد جھجک محسوس کرتے ہیں، وہ اپنی فکر و خیالات کو دلیل کی رو سے پیش کرنے کی ہمت نہیں کرتے، جب تک کہ وہ فکر اور وہ خیالات معاشرے میں رائج فکر و خیالات کے موافق نہ ہوں۔

لیکن اخروی جوابدہی ایک ایسا مرحلہ ہے جس سے کسی کو چھٹکارا نہیں، اللہ رب العزت کے سامنے ہر امیر و فقیر کا کھڑا ہونا ایک بدیہی حقیقت ہے، اور ہر آدمی کا اپنی ہر ذمہ داری کے لیے جوابدہ ہونا ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔

لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ:

برِّ صغیر یعنی آج کا پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت تاریخ کی رو سے ہمارا دیس ہے یا ہمارے دشمنوں کا دیس ہے؟ یا دوست و دشمن سب کا دیس ہے؟ یہ سوال اٹھاتے ہوئے مجھے یہ بات صاف طور پر معلوم ہے کہ، آج یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا سائل دوست و دشمن ہر ایک کی نظر میں مخدوش اور موردِ الزام ہے، بلکہ اگر کہا جائے کہ یہ سوال آج کی دنیا میں عجائبِ دنیا اور غرائبِ عالم میں شامل ہے تو یہ کوئی مبالغہ نہیں ہو گا۔

جس وقت میں 'ہمارے' سے ہم مسلمان اور 'دشمن' سے غیر مسلم اقوام مراد لے رہا ہوں، اس وقت دنیا میں اقوام انسانی میں یہ فرق اور یہ تقسیم روا نہیں ہے، اور ایسی تفریق کی اجازت نہیں۔

لیکن، جس خالقِ کائنات سے ہمارا رشتہ ہے، جس رسولِ عربی ﷺ سے ہماری پہچان ہے، اور جن سلفِ امت کے ہم وارث ہیں...... اس خالقِ کائنات کا حکم، اس رسولِ عربی ﷺ کی راہنمائی اور ان اسلاف کی تاریخ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ، ہم حق بات کو کہے بغیر نہ رہیں۔ ہمارے رب سے ہمیں یہ اجازت نہیں ملے گی، ہمارے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ بے وفائی ہو گی اور اسلاف کی امانت کے ساتھ یہ خیانت ہو گی، لہٰذا ہم حق بات تو ضرور کہیں گے، شرعی ذمہ داری کی رو سے کہیں گے، قرآن، سنت اور فقہِ اسلامی کی روشنی میں کہیں گے۔ واللہ الموفق والمعین۔

تاریخ بتاتی ہے کہ برِّ صغیر، یعنی پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت کے علاقوں نے مسلمان حکمران اور اسلامی قانون کے تحت ایک طویل مدت گزاری، جس مدت میں یہ سرزمین قرآن، حدیث اور فقہِ اسلامی کی رو سے دار الاسلام تھی۔ البتہ اس حقیقت سے ہمیں انکار نہیں کہ اس برِّ صغیر کے تاریخی ادوار بہت ہی مختلف بلکہ پیچیدہ بھی ہیں، آپ اگر کہیں کہ اس کی ہر صدی اپنی اگلی اور پچھلی صدی سے مختلف ہے تو یہ خلافِ واقع نہیں ہو گا۔ خاص طور پر اس کی جغرافیائی حدود بہت ہی مختلف ہوتی رہیں اور مسلمان حکمرانوں کے ایمان و عقائد کی حالت بہت ہی مختلف رہی، جن میں بعض تو ایسے بھی گزرے جن کو شریعت کی رو سے مسلمان کہنا مشکل ہے اور بعض ایسے تھے جن کو اگرچہ مسلمان کہا جاسکتا ہے لیکن وہ نہ تو صحیح عقیدے کے حامل تھے اور نہ ہی صحیح عقیدے کے ساتھ ان کی کوئی پہچان تھی۔ ان وجوہ کی بنا پر تاریخ کے ہر دور کے حالات کی تشخیص ذرا مشکل ہے۔

لیکن تاریخ کے جس حصے کے بارے میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں اور جس حصے پر کوئی پردہ نہیں، اس کی شرعی حیثیت ہمارے سامنے آجائے تو ہمارے موجودہ مسائل حل کرنے میں ان شاء اللہ بہت مدد ملے گی اور ہم جن مسائل کی پیچیدگی کی وجہ سے دوٹوک بات کہنے کی ہمت نہیں کرتے وہ بھی اجاگر ہو کر سامنے آجائے گی، ان شاء اللہ۔

برِّصغیر (ہندوستان) کی تاریخ میں جن مسلم حکمرانوں نے اسلامی آئین اور شرعی قانون کے مطابق حکومت چلانے کی کوشش کی اور قرآن وسنت کے احکام کو نافذ کرنے میں کچھ حصہ لیا وہ مندرجہ ذیل ہیں:

- الملک الصالح ناصر الدین محمود (۶۶۴ھ)
- الملک العادل غیاث الدین بلبن (۶۸۶ھ)
- الملک الفاتح علاء الدین خلجی (۷۱۶ھ)
- السلطان الکامل شمس الدین التمش (۷۳۳ھ)
- الملک القاہر محمد تغلق (۷۵۲ھ)
- الملک الکریم فیروز شاہ (۷۹۹ھ)
- الملک الفاضل سکندر بن بہلول لودھی (۹۲۳ھ)
- الاداری النابغۃ شیر شاہ سوری (۹۵۲ھ)
- شاہ جہاں تیموری (۱۰۶۸ھ)
- ناصر الدین والسنۃ اورنگ زیب عالم گیر (۱۱۱۸ھ)

ان کے علاوہ اور بھی حکمران اور امراء گزرے جنہوں نے ہندوستان کے مختلف خطوں میں اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی اور ایک حد تک وہ کامیاب بھی ہوئے۔ اس سلسلے کی جو آخری کڑی تھی، وہ ہے سلطنتِ مغلیہ کے آخری سلطان بہادر شاہ ظفر، کہ جن کے بعد حکومت اسلامیہ کے نام سے جو سلطنت باقی تھی وہ بھی مٹ کر رہ گئی۔ یہاں پر ہندوستان کو دار الحرب قرار دینے کے بارے میں شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا جو تاریخی فتویٰ ہے اس کا کچھ پس منظر بھی ہماری گفتگو میں آجائے تو مناسب ہو گا اور زیرِ بحث مسئلے کو حل کرنے میں ان شاء اللہ تعالیٰ آسانی ہو گی۔

ہم اس تاریخی پسِ منظر کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے ہیں، بلکہ اس کے اس حصہ کو ہم زیر بحث لائیں گے جس حصے کے ساتھ ہمارے اس مسئلے کی وابستگی ہے، اور جس حصے کو اجاگر کرنے سے ان شاء اللہ ہمیں اس مسئلے کے نتیجے پر پہنچنے

میں کوئی تردد نہیں ہو گا، اور جس حصے کے سامنے آجانے سے مسئلے کے حتمی نتیجے کے لیے دوسرے حصوں کی طرف دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

ہندوستان (برِّصغیر) میں جب تک مسلمان حکمرانوں کے تحت اسلامی شریعت نافذ رہی تب تک اس سرزمین کو دار الحرب قرار دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، بلکہ اس کا جواز بھی نہیں تھا۔ لیکن جب حالت بدل گئی اور حکومت وحکمرانی مسلمان حکمرانوں کے ہاتھوں سے غیر مسلموں کے ہاتھ میں چلی گئی تو اس برِّصغیر کی اصلی حالت یعنی شرعی حیثیت کو بیان کرنا ضروری تھا، خاص طور پر ۱۷۵۷ء میں جب نواب سراج الدولہ اور ۱۷۹۹ء میں سلطان فتح علی ٹیپو انگریز کے ہاتھوں شہید ہو گئے اور مسلمان فوج نے شکست کھائی، تو اس برِّصغیر (ہندوستان) میں مسلمانوں کے پاس ایسی کوئی دفاعی طاقت باقی نہ رہی جس سے انگریزوں کا مقابلہ کر سکیں یا اپنے دائرۂ حکومت میں اسلامی آئین اور اسلامی شریعت کو نافذ کر سکیں۔

دہلی میں اس وقت تک مغل سلطنت کا ٹمٹماتا چراغ بجھا نہیں تھا، سلطنتِ مغلیہ شاہ عالم ثانی کے ہاتھ میں تھی، حقیقت میں شاہ عالم کے ہاتھ میں فقط دہلی کے لال قلعہ کے محض کھنڈرات اور شاہی آسائش اور زیبائش کا سامان تھا اور مسلمانوں کے حکمران ہونے کی حیثیت سے ان کے ہاتھ میں کچھ نہ تھا۔ ہندوستان پر نہ مرکزی حکومت کا کوئی کنٹرول تھا، اور نہ کسی مقامی حکومت کا کنٹرول تھا۔ انگریز اور دیگر غیر اسلامی طاقتیں ان حالات کو صحیح طریقے سے بھانپ چکی تھیں، اور سو فی صد آزادی کے ساتھ حکومت کے مرکزی اداروں کو اپنے ہاتھ میں لے چکی تھیں، قانون ساز اداروں اور تنفیذی اداروں پر اپنا سکہ جما چکی تھیں، فوجی طاقتیں تو ان کے ہاتھ میں پہلے ہی تھیں، یعنی ہندوستان کا ایسا حال تھا جو کسی ذمہ دار عالم کو اور امت کے کسی راہبر کو چین کے ساتھ جینے نہیں دے سکتا تھا، یہاں تک کہ وہ اپنے کاندھوں پر موجود شرعی ذمہ داری کو ادا نہ کر لے اور اپنے فریضۂ منصبی کو بجانہ لائے۔

سراج الہند شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ دیا اور ایک راہبر ہونے کی حیثیت سے امت کو یہ پیغام پہنچا دیا کہ اب سے تمہاری ذمہ داری میں کچھ ایسے فرائض شامل ہو گئے ہیں جو تم پر ایک دار الاسلام کے باشندے ہونے کی حیثیت سے پہلے نہ تھے۔

جس پس منظر اور جن وجوہ کی بنا پر یہ فتویٰ وقت کا حتمی فریضہ تھا وہ یہ ہیں:

۱. ہندوستان میں اسلام کی قانونی حیثیت مفقود ہو گئی تھی۔
۲. ہندوستان کا حاکمِ اعلیٰ مسلمان ہونے کے باوجود اسلامی قانون نافذ کرنے پر قادر نہ تھا۔
۳. آئینی اداروں، عدالتوں، قانون ساز اسمبلیوں یا کونسلوں پر قرآن، حدیث اور اسلامی شریعت کی نگرانی نہ چلتی تھی۔
۴. سارے آئینی ادارے، عدالتیں اور قانون ساز اسمبلیاں غیر اسلامی طاقتوں کی اپنی رائے اور ان کے فیصلہ کی نگرانی اور ان کے خیال کے قبضے میں تھیں۔
۵. مسلمان اپنی عبادات، معاملات اور اسلامی چال چلن میں اتنا ہی کر سکتا تھا جتنا اس کو غیر اسلامی آئین اور غیر اسلامی حکمرانوں سے کرنے کی اجازت ملتی تھی۔
۶. وہ حکومت اپنے خرچ سے مدارس چلاتی تھی، لیکن مدارس میں پڑھائے گئے مسائل کو سماج میں نافذ کرنے نہیں دیتی تھی۔
۷. اس حکومت کی باگ ڈور پکڑنے والے مدارس کے صدر بھی بنتے تھے، لیکن قرآن و حدیث کے ضوابط و قوانین کو وہ دل سے ناپسند کرتے تھے۔

یہ وہ حالات تھے جن کا دوست دشمن کوئی انکار نہیں کر سکتا، اور نہ انکار کرنے کی کوئی ضرورت ان کے دل میں ہے، کیونکہ ان حالات نے ایسی ایک باریک اور پوشیدہ تار اور پائپ لائن کے ذریعے اس سماج کو گھیر لیا تھا کہ اکثر و بیشتر کو پتہ بھی نہ چلا کہ کہاں کا پانی کہاں پہنچ رہا ہے۔

لیکن اسلام کے بیدار ذمہ داروں کی آنکھیں اس طرح کھلی ہوتی ہیں کہ ان کے سامنے سے خلاف شرع کوئی حالات اور خلاف شرع کوئی مرحلہ چھپ کر گزر نہیں سکتا، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس برِّ صغیر کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ دیا اور اللہ کے بندوں کا ایک طائفہ ایسا کھڑا ہو گیا جو اس فتوے کی رو سے جو جو کرنا چاہیے تھا وہ سب کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

اس فتوے کا پس منظر اور جن جن وجوہ کی بنیاد پر یہ جاری کیا گیا تھا آج تک برابر ویسی ہی باقی ہیں جیسے دمِ اجرائے فتویٰ تھیں۔

اس فتوے کے تقریباً دو صدی اور ایک ربع صدی کے بعد کا زمانہ آج ہم گزار رہے ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ جس پسِ منظر اور جن وجوہ سے دو سو، سوا دو سو برس پہلے برِّصغیر (ہندوستان) کو دار الحرب قرار دیا گیا تھا وہ وجوہ اور حالات آج تک مسلسل وہی چلے آرہے ہیں یا نہیں؟

اس بات کا کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ پچھلی ان دو صدیوں میں حالات بدلتے رہے، اور یہ ایک ناممکن بات ہے کہ اتنی لمبی مدت تک حالات بدلے بغیر دنیا چلے، یہ نہیں ہو سکتا، لیکن ہماری بات جو چل رہی ہے وہ شرعی حیثیت سے ہے۔ ہم کہنا چاہتے ہیں کہ شریعت کی میزان میں اگر تولا جائے تو ہر صاحبِ بصیرت آدمی کو یہ کہنا پڑے گا کہ دو سو برس پہلے کے حالات اور دو سو برس بعد کے حالات میں کوئی فرق نہیں آیا۔

غور کیجیے کہ:

١. ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی قانون ساز اسمبلیاں، عدالتیں اور کسی آئینی ادارے پر قرآن، حدیث اور اسلامی شریعت کی کسی قسم کی نگرانی اور کسی قسم کا غلبہ اور قبضہ نہیں ہے۔
٢. برِّصغیر کے ان تینوں ملکوں میں ہر قانون اور ہر آئین ان ملکوں کے سربراہوں کی رائے اور فیصلے پر بنتے ہیں چاہے وہ سربراہ مسلم ہو یا غیر مسلم ہو۔
٣. بلکہ انگریز نے جس آئین پر اس ملک کو چلا کر ایک دار الاسلام کو دار الحرب تک پہنچا دیا، وہی برٹش آئین اور قانون آج بھی اس برِّصغیر کے ملکوں میں قانون ساز کی حیثیت سے اپنی پوری قدرت، طاقت اور پوری تازگی کے ساتھ کارگر اور برقرار ہے۔
٤. ان ملکوں پر ایسے حکمرانوں کا تسلط ہے جو اخروی نجات کے لیے صرف ایک دین یعنی دینِ اسلام کے اتباع کو ضروری نہیں سمجھتے۔

۵. برِّصغیر کے ان ملکوں کے جو حکمران ہیں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ کسی مسلمان کو اپنے اسلامی قانون پر چلنے کے لیے حکمرانوں کے بنائے ہوئے قانون سے اجازت لینی ہوگی، غیر مسلموں کے بنائے ہوئے قانون سے، اللہ اور اللہ کے رسول کے دشمنوں کے بنائے ہوئے قانون سے اجازت لینی ہوگی۔

٦. ان حکمرانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام کے نام پر قرآن وحدیث کے حوالے سے کوئی قانون بنانا اور اس کو نافذ کرنا جرم ہے اور قابلِ سزا جرم ہے۔

ان امور میں بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش یعنی سابق ہندوستان (برِّصغیر) کے ان تینوں ملکوں کا حال برابر ہے۔ فرق جتنا ہے وہ بھی ہم ذکر کر رہے ہیں، اسی طرح شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے جب اس برِّصغیر کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ دیا تو اس وقت کی حالت اور آج کل کی حالت بھی برابر ہے، فرق جتنا ہے وہ بھی ہم ذکر کریں گے۔

اس موقع پر ایک بات یاد رہنی چاہیے کہ ہندوستان پر دار الحرب کی حیثیت سے تین مراحل گزرے۔ ایک مرحلہ تو وہ جب فتویٰ صادر ہو رہا تھا، اس وقت حکمران مسلمان تھا لیکن قبضہ غیر مسلموں کا تھا، عدالت اور آئینی ادارے غیر مسلموں کی نگرانی اور غیر اسلامی قانون کے ماتحت چلتے تھے، یہ مرحلہ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک کا مرحلہ ہے، دوسرا مرحلہ وہ تھا جب حکمران غیر مسلم تھے، یہ مرحلہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کا مرحلہ ہے، اور تیسرا وہ مرحلہ ہے جب کچھ حصے پر حکمران غیر مسلم ہیں اور کچھ حصہ پر حکمران مسلم ہیں لیکن ہر حصے پر قبضہ غیر مسلموں کا ہے، عدالت اور آئینی ادارے غیر مسلم اور غیر اسلامی قانون کے ماتحت ہیں، یہ مرحلہ ۱۹۴۷ء سے اب تک چل رہا ہے۔

ان تینوں مراحل کے مابین جو فرق ہے ان کی تفصیل کچھ ایسی ہے:

پہلے مرحلے اور دوسرے مرحلے میں اس خطے کا نام تھا ہندوستان، اب یہ خطہ تین الگ الگ ناموں سے موسوم ہے، بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش۔

پہلے مرحلے میں حکمران مسلمان تھے، نام کے واسطے دیس مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، لیکن سرکاری سارے اداروں پر غیر مسلموں کا تسلط تھا، دوسرے مرحلے میں حکمران غیر مسلم تھے، عدالت اور آئینی ادارے بھی انہیں کے تھے، اور تیسرے مرحلے میں کچھ حصوں کے حکمران خود کو غیر مسلم سمجھتے ہیں اور کچھ حصوں کے حکمران خود کو مسلمان سمجھتے ہیں، البتہ سب کی عدالتیں اور آئینی ادارے غیر مسلموں کی نگرانی اور غیر اسلامی قانون پر چلتے ہیں، ہر حصے کا حکمران چاہے وہ خود کو مسلمان سمجھتا ہو یا غیر مسلم، ہر ایک یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ عدالت اور آئینی اداروں میں قرآن، حدیث اور اسلامی شریعت کی مداخلت وقت کا سب سے بڑا جرم ہے۔

پہلے اور دوسرے مرحلے میں اکثر مسلمان اور راہبرانِ امت غیر مسلموں کے تسلط اور غیر اسلامی قوانین کی ماتحتی پر ناراض تھے، لیکن تیسرے مرحلے میں غالب طبقہ غیر مسلموں کے تسلط اور غیر اسلامی قوانین کی ماتحتی پر راضی ہے یا سکوت اختیار کیے ہوئے ہے۔

پہلے اور دوسرے مرحلوں میں اکثر مسلمان ان حالات سے خود کو نکالنے اور آزاد کرنے کو ایک شرعی ذمہ داری سمجھتے تھے، اب اکثر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ غیر اسلامی حکومت اور غیر اسلامی آئین اور عدالت کے ماتحت زندگی بسر کرنا بھی ایک طرزِ زندگی ہے، البتہ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ اس حالت سے نجات کی کوئی صورت نہیں، اور بعض یہ سمجھتے ہیں کہ اس حالت سے نجات کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو لوگ نکلنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور ممکن سمجھ کر کوشش بھی کر رہے ہیں انکا ذکر بھی آنا چاہیے اگرچہ اکثر غلط طریقے سے کر رہے ہیں۔

پہلے اور دوسرے مرحلوں میں غیر مسلموں کے نمائندوں کو گورنر اور وائس رائے کہا جاتا تھا، اب ان کے نمائندوں کو ایمبیسڈر، سفیر اور اقوام متحدہ کا نمائندہ کہا جاتا ہے۔

پہلے مرحلے میں غیر مسلموں کے تسلط کی کوئی قانونی حیثیت نہ تھی، البتہ ان کا زور چلتا تھا، دوسرے مرحلے میں سب ان ہی کے ہاتھ میں تھے، اور تیسرے مرحلے میں ان کے تسلط کو قانونی حیثیت مل گئی اور ان کا زور ہوتے ہوئے بھی اسے چھپانے کے لیے بہت سی چالیں چلی جاتی ہیں جن کو سب جانتے بھی ہیں، اور سب مل کر چھپاتے بھی ہیں، اسے آپ اوپن سیکرٹ بھی کہہ سکتے ہیں۔

پہلے اور دوسرے مرحلوں میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ مسلمانوں کے لیے غیر اسلامی قانون کے تحت زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں، تیسرے مرحلہ میں عام طور پر اور علی الاعلان یہ سمجھا جارہا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔

یاد رہے کہ یہ سب کچھ ایسا فرق ہے جو اصل مسئلے پر کوئی اثر نہیں رکھتا، یعنی اس فرق سے کوئی دار الحرب دار الحرب ہونے سے نہیں نکلتا، اس عالم کے کسی خطے کو دار الحرب قرار پانے کے لیے اس میں جو باتیں پائی جانی ضروری ہیں وہ جس طرح انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں تھیں، اسی طرح ۱۸۵۷ عیسوی کے بعد بھی وہ باتیں موجود رہیں، اور ۱۹۴۷ عیسوی کے بعد سے اب تک بھی موجود ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ انیسویں صدی کے شروع میں برِّ صغیر (ہندوستان) کے دار الحرب قرار پانے کے بعد مسلمانوں پر جو فرائض عائد تھے، اور جو فرائض ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کے ذمے تھے، وہ فرائض اور واجبات ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک مسلمانوں کے ذمے باقی ہیں، چاہے اس خطے کا نام بھارت ہو، چاہے اس خطے کا نام پاکستان ہو، اور چاہے اس خطے کا نام بنگلہ دیش ہو، ان تمام خطوں کے تمام مسلمانوں پر وہ فرائض اور واجبات اسی طرح بحال ہیں جس طرح وہ دو صدی پہلے ان پر تھے، کیونکہ ان فرائض کے ساقط ہونے اور ان ذمہ داریوں سے خلاصی کا کوئی مرحلہ ان دو صدیوں میں پورا نہیں ہوا۔

اس موقع پر ہم تین امور ذرا تفصیل سے پیش کرنا چاہتے ہیں، پہلا امر تو یہ ہے کہ یہ خطۂ زمین دو سو برس پہلے کیوں دار الحرب بنا اور اب بھی کیوں دار الحرب ہے؟ دوسرا امر اس کہانی کی مختصر تصویر ہے جو دو سو برس سے ہم پر گزری، تیسرا امر یہ ہے کہ ایک دار الاسلام کے دار الحرب بننے کے بعد اس کو دار الاسلام بنانے کی جو 'فرض' ذمہ داری ہم پر عائد ہوئی تھی اور وہ اب تک ادا نہ ہو سکی، تو اب دو سو برس گزر جانے کے بعد اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اور شریعت کی طرف سے ہم پر کیا کیا فرائض عائد ہوتے ہیں؟ اللہ توفیق عطا فرمائے۔

برِّ صغیر کیوں دار الحرب بنا اور اب بھی کیوں دار الحرب ہے؟

برِّ صغیر (ہندوستان) کیوں اور کیسے دار الحرب بنا؟ ایک زمانے تک یہ بات مسلمانوں کو معلوم تھی، عرصۂ دراز تک وہ جانتے تھے کہ، ان کی یہ اسلامی سلطنت کیسے اور کیوں دار الحرب بن گئی؟ رفتہ رفتہ زمانہ گزرتا گیا اور مسلمان اپنے ماضی کو بھولتا گیا، مسلمانوں کی آنکھوں اور دلوں سے دار الحرب اور دار الاسلام کا فرق او جھل ہوتا چلا گیا، دار الاسلام کی حقیقت سمجھنا مسلمانوں کے لیے مشکل ہو گیا۔ حتیٰ کہ اس بات کو اور اس داستان کو از سر نو ابھارنا وقت کی ضرورت بن گیا، لہٰذا ہم اس کو کچھ عرض کر رہے ہیں۔

یہاں دو باتیں عرض کرنی ہیں، ایک بات ہے اس بارے میں کتاب کا مسئلہ، اور دوسری بات ہے ہندوستان کی حالت جو مسئلے کا مصداق ہے۔

کتاب کا مسئلہ

کتاب و سنت کی رو سے ہمارے ائمۂ مجتہدین نے دار الحرب کی جو تعریف کی اور کسی دار الاسلام کے دار الحرب میں بدل جانے کے جو اسباب بتائے ہیں ان میں دو باتیں خاص طور پر ملحوظ ہیں، ایک ہے اہلِ کفر کا غلبہ اور دوسری ہے کفار کے احکام کا رواج۔ یہ دو باتیں ایسی ہیں جو اگر اسلام اور مسلمانوں کے حق میں ہوں تو دار الحرب دار الاسلام بن جائے گا، مطلب یہ کہ، اگر کسی ملک میں مسلمانوں کا غلبہ ہو جائے اور اسلامی شریعت کے قوانین نافذ ہو جائیں تو وہ دار الحرب دار الاسلام بن جائے گا۔

امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۷۰ھ) لکھتے ہیں:

”ووجه هذا القول: أنَّ حكم الدار إنما يتعلق بالظهور والغلبة، وإجراء حكم الدين بها، والدليل على صحة ذلك: أنا متى غلبنا على دار الحرب، وأجرينا أحكامنا فيها: صارت دار

”اس مسئلہ کی تفصیل یہ ہے کہ، دار کا حکم غلبے اور ظہور سے متعلق ہے، اسی طرح وہاں دین کے احکام جاری کرنے کے ساتھ ہے، اس بات کی صحت کی

إسلام، سواء كانت متاخمة لدار الإسلام أو لم تكن، فكذلك البلد من دار الإسلام، إذا غلب عليه أهل الكفر، وجرى فيه حكمهم: وجب أن يكون من دار الحرب."[1]

دلیل یہ ہے کہ، ہم جب دار الحرب پر غلبہ حاصل کرتے ہیں اور وہاں ہمارے احکام جاری ہوتے ہیں تو وہ دار الاسلام بن جاتا ہے، چاہے وہ دار الاسلام سے ملا ہوا ہو یا ملا ہوا نہ ہو، تو ایسا ہی اگر دار الاسلام کے کسی شہر یا خطے پر کفار کا غلبہ ہو جائے اور اس میں ان کا حکم جاری ہو جائے تو وہ ضرور دار الحرب میں سے ہو جائے گا۔"

امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وعن أبی یوسف ومحمد رحمہما الله تعالی: إذا أظهروا أحكام الشرك فيها فقد صارت دارهم دار حرب؛ لأن البقعة إنما تنسب إلينا أو إليهم باعتبار القوة والغلبة، فكل موضع ظهر فيه حكم الشرك فالقوة فی ذلك الموضع للمشركين، فكانت دار حرب، وكل موضع كان الظاهر فيه حكم الإسلام فالقوة فيه للمسلمين." [2]

"اور ابو یوسف و محمد رحمہما اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں کہ، جب وہ شرک کے احکام کو رواج دیں گے تو ان کا یہ دار، دار الحرب بن جائے گا؛ کیوں کہ زمین کا کوئی حصہ قوت اور غلبہ کے اعتبار سے ہماری یا ان کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر وہ علاقہ جہاں شرک کے احکام کا غلبہ اور رواج ہے وہاں قوت مشرکین کے لیے ثابت ہے، لہٰذا وہ دار الحرب ہو جائے گا، اور ہر وہ علاقہ جہاں اسلام کے احکام کا غلبہ اور رواج ہے، وہاں قوت مسلمانوں کے لیے ثابت ہے۔"

علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۵۸۷ھ) لکھتے ہیں:

[1] شرح مختصر الطحاوی للجصاص (المتوفى ۳۷۰ھ)، كتاب السير والجهاد ۲۱۷/۷-۲۱۶، دار البشائر الإسلامية بيروت، لبنان، الطبعة الأولى ۱۴۳۱ھ

[2] المبسوط للسرخسی (المتوفى ۴۸۳ھ)، كتاب السير، باب المرتدين، ۱۱۴/۱۰، دار المعرفة، بيروت، لبنان

"فصل: فی اختلاف الأحکام باختلاف الدارين وأما بيان الأحكام التى تختلف باختلاف الدارين؛ فنقول: لا بد أولا من معرفة معنى الدارين؛ دار الإسلام ودار الكفر؛ لتعرف الأحكام التى تختلف باختلافهما، ومعرفة ذلك مبنية على معرفة ما به، تصير الدار دار إسلام أو دار كفر؛ فنقول: لا خلاف بين أصحابنا فی أن دار الكفر تصير دار إسلام بظهور أحكام الإسلام فيها." [3]

"فصل: دارین کے اختلاف سے احکام کے اختلاف کے بیان میں ان احکام کا بیان جو دارین کے اختلاف سے مختلف ہوتے ہیں، پس ہم کہتے ہیں کہ؛ سب سے پہلے دارین یعنی دار الاسلام اور دار الکفر کا معنیٰ جاننا چاہیے، تاکہ ان دو دار کے اختلاف سے احکام میں جو اختلافات ہوتے ہیں وہ معلوم ہو جائیں، اور یہ جاننا اس بات کے جاننے پر موقوف ہے کہ، دار الاسلام اور دار الکفر کس وجہ سے بنتا ہے؟ تو ہم کہتے ہیں کہ: اس بات میں ہمارے ائمۂ کرام کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ، دار الکفر میں اسلامی احکام جاری ہونے سے دار الاسلام بن جاتا ہے۔"

ان تینوں حوالوں سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ، ملک پر مسلمانوں کا غلبہ اور اسلامی آئین کے نفاذ کے بغیر کوئی بھی ملک دار الاسلام نہیں بن سکتا، جب تک کفار کا غلبہ ہے اور قوانین غیر اسلامی ہیں تب تک وہ دار دار الحرب ہی رہے گا۔ ساتھ ساتھ امام سرخسی کی عبارت سے یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ، غلبہ اور قوت بھی احکام کے نفاذ سے ثابت ہوتی ہے، ان کی اس عبارت کو دوبارہ ملحوظ فرمائیں:

"فكل موضع ظهر فيه حكم الشرك فالقوة فی ذلك الموضع للمشركين، فكانت دار حرب، وكل موضع كان الظاهر فيه حكم الإسلام فالقوة فيه للمسلمين."

"لہٰذا ہر وہ علاقہ جہاں شرک کے احکام کا غلبہ اور رواج ہے تو وہاں قوت مشرکین کے لیے ثابت ہے، لہٰذا وہ دار الحرب ہو جائے گا، اور ہر وہ علاقہ جہاں

---

[3] بدائع الصنائع لعلاء الدين الكاسانی (المتوفی ۵۸۷ھ)، كتاب السير، فصل فی اختلاف الأحكام باختلاف الدارين، ۵۱۹/۹-۵۱۸، دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان، الطبعة الثانية ۱۴۲۴ھ

اسلام کے احکام کا غلبہ اور رواج ہے، تو وہاں قوت مسلمانوں کے لیے ثابت ہے۔"

اسی وجہ سے ہندوستان میں جب کفار کا غلبہ ہو گیا، اور قوانین غیر شرعی چلنے لگے، قرآن و سنت کے بتلائے ہوئے حلال حرام ہونے لگے اور حرام حلال ہونے لگے، اسی طرح فرائض محظورات سے بدلنے لگے اور محظورات واجبات کے مقام پر فائز ہونے لگے، تو وقت کے ذمہ داران، علمائے حقانی و ربانی نے اس ملک کو دار الحرب قرار دے کر فتویٰ دیا، حالانکہ اس ملک کو جب دار الحرب قرار دے کر فتویٰ دیا جا رہا تھا تو اس وقت اس ملک کے سلطان اور بادشاہ مسلمان تھے، حکمرانی کے تخت پر مسلمان بادشاہ رونق افروز تھے، نمازیں بھی پڑھی جاتی تھیں، روزے بھی رکھے جاتے تھے، حج کا سفر ہوتا تھا، مسلمان زکوٰۃ بھی ادا کرتے تھے، اذانیں ہوتی تھیں، محفلیں بھی چلتی تھیں، دعوت و تبلیغ کا کام بھی چلتا تھا، مدارس میں پڑھنا پڑھانا بھی جاری تھا، غرض ایسے سینکڑوں اسلامی امور اپنے حال پر بحال تھے، لیکن پھر بھی یہ ملک دار الاسلام کی حیثیت کو کھو کر دار الحرب بن گیا، اس کا سبب یہ ہے کہ، غلبہ اہل کفر کا ہے اور قوانین غیر شرعی قوانین ہیں، قوت و شوکت کفر و شرک کی ہے۔

اور انہی مرکزی دو باتوں کی بنا پر برِّصغیر ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا گیا، اور اسی فتویٰ کی بناء پر کفری غلبہ اور کفری آئین کے خلاف علمائے اسلام کی قیادت میں مسلمانانِ ہند میدان جہاد میں لڑتے رہے۔

البتہ کسی دار الاسلام کے دار الحرب بننے کے لیے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مزید اور دو باتیں بتائیں، ایک یہ کہ، کسی ملک میں دار الاسلام ہونے کی وجہ سے اور دار الاسلام ہونے کی حیثیت سے جو امن و امان تھا وہ بحال رہے اور وہ ملک کسی دار الکفر سے ملا ہوا نہ ہو۔ یاد رہے، ہندوستان جب دار الحرب بن گیا اس وقت جنہوں نے کفار کے کفری قوانین مان لیے، کفار کے تسلط کو اپنے لیے کوئی مصیبت نہیں سمجھا بلکہ کفار کی ماتحتی کو اپنے لیے باعث فخر سمجھنے لگے، ان کے امن اور راحت میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا، پھر بھی ہندوستان دار الحرب بن گیا تھا، لہٰذا امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جس امن و امان کی بات کر رہے ہیں وہ اس قسم کے لوگوں کی راحت اور امن نہیں، کیوں کہ اگر ان جیسے لوگوں کی راحت مراد ہوتی تو اس وقت بھی ہندوستان دار الحرب نہیں بنتا، بلکہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ، دنیا میں کوئی

دار الحرب کبھی دار الحرب نہیں بن سکتا، کیوں کہ ہر دار الحرب میں آپ کو ایسے مسلمان مل جائیں گے جو کفار کے کفری قوانین اور کفار کے تسلط کو سر آنکھوں پر رکھتے ہیں اور کفار کے طرزِ حکمرانی کو تسلیم کرتے ہیں، ان کے امن و راحت میں کبھی کوئی خلل نہیں آیا، تو یہ امن وراحت امام ابو حنیفہ کا مقصد نہیں۔

اس مسئلہ کی مزید تفصیل کے لیے بدائع کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں:

"واختلفوا في دار الإسلام أنها بماذا تصير دار الكفر؟ قال أبو حنيفة: إنها لا تصير دار الكفر إلا بثلاث شرائط: أحدها: ظهور أحكام الكفر فيها، والثاني: أن تكون متاخمة لدار الكفر، والثالث: أن لا يبقى فيها مسلم ولا ذمي آمنا بالأمان الأول، وهو أمان المسلمين.
وقال أبو يوسف، ومحمد - رحمهما الله: إنها تصير دار الكفر بظهور أحكام الكفر فيها.
وجه قولهما أن قولنا دار الإسلام، ودار الكفر إضافة دار إلى الإسلام وإلى الكفر، وإنما تضاف الدار إلى الإسلام أو إلى الكفر لظهور الإسلام أو الكفر فيها، كما تسمى الجنة دار السلام، والنار دار البوار؛ لوجود السلامة في الجنة، والبوار في النار. وظهور الإسلام والكفر بظهور أحكامهما، فإذا ظهرت أحكام الكفر في دار، فقد صارت دار كفر فصحت الإضافة، ولهذا صارت الدار دار الإسلام بظهور أحكام الإسلام فيها من غير شريطة أخرى، فكذا تصير دار الكفر بظهور أحكام الكفر فيها، والله أعلم.

"البتہ دار الاسلام کس وجہ سے دار الکفر بنے گا، اس بارے میں انہوں نے اختلاف کیا۔ امام ابو حنیفہ نے کہا: تین شرائط پائی جانے کے بغیر دار الاسلام دار الحرب نہیں بنے گا۔
ایک ہے اس میں کفر کے احکام کا نافذ ہونا، دوسرا ہے دار الحرب کے سائے میں ہونا، تیسرا ہے کسی مسلمان یا کسی ذمی کا سابقہ امن کی بدولت مامون نہ رہنا یعنی مسلمان کی طرف سے دیا ہوا امن۔
اور امام ابو یوسف وامام محمد رحمہا اللہ کہتے ہیں: کہ دار الاسلام میں کفری احکام کے نفاذ سے وہ دار الکفر بن جائے گا۔
امام ابو یوسف اور امام محمد کے قول کی دلیل یہ ہے کہ ہمارا کسی دار کو دار الاسلام یا دار الکفر کہنا، اس کو اسلام اور کفر کی طرف نسبت کی وجہ سے ہے، دار کو اسلام کی طرف یا کفر کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس دار میں اسلام یا کفر کے غلبے کے اعتبار سے، جیسے جنت کو دار السلام (سلامتی کی جگہ) اور جہنم کو دار البوار (بربادی کی جگہ) کہا جاتا ہے؛ جنت میں سلامتی اور جہنم میں

وجه قول أبى حنيفة - رحمه الله - أن المقصود من إضافة الدار إلى الإسلام والكفر ليس هو عين الإسلام والكفر، وإنما المقصود هو الأمن والخوف، ومعناه أن الأمان إن كان للمسلمين فيها على الإطلاق، والخوف للكفرة على الإطلاق، فهى دار الإسلام، وإن كان الأمان فيها للكفرة على الإطلاق، والخوف للمسلمين على الإطلاق، فهى دار الكفر." [4]

بربادی پائے جانے کی وجہ سے، اور اسلام یا کفر کا غلبہ ان دونوں کے احکام کے غلبے اور نفاذ سے ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی دار میں کفر کے احکام کا غلبہ ورواج ہو جائے تو وہ دار دار الکفر بن جائے گا، اور کفر کی طرف دار کی اضافت صحیح ہوگی، اسی طرح کسی دار میں احکامِ اسلام کے نفاذ اور غلبہ سے وہ دار دار الاسلام بن جائے گا، اور کسی شرط کی ضرورت نہ ہوگی، اسی طرح کفر کے احکام کے نفاذ اور غلبہ سے دار الکفر بن جائے گا، واللہ اعلم۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ، دار کو اسلام اور کفر کی طرف نسبت کرنے سے عین اسلام اور عین کفر مقصد نہیں، بلکہ مقصد ہے امن اور خوف، جس کا مطلب یہ ہے کہ، اگر بلا کسی قید وبند کے امن مسلمانوں کے لیے ہے اور خوف کفار کے لیے ہے تو وہ دار الاسلام ہے، اور اگر بلا کسی قید وبند کے امن کفار کے لیے ہے اور خوف مسلمانوں کے لیے ہے تو وہ دار الکفر ہے۔"

[4] بدائع الصنائع لعلاء الدين الكاسانى (المتوفى ٥٨٧هـ)، كتاب السير، فصل فى اختلاف الأحكام باختلاف الدارين، ٥١٩/٩، دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان، الطبعة الثانية ١٤٢٤هـ

ہندوستان کی حالت

قرآن وحدیث کی رو سے دار الحرب اور دار الاسلام کا جو مصداق نکلتا ہے اسی کی روشنی میں علمائے وقت اپنے ملکوں کے بارے میں فتویٰ دیتے ہیں اور ملک کے باشندوں کو ان کی ذمہ داری کی طرف متوجہ کراتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی عظیم سلطنت پر غیر مسلموں کا تسلط جوں جوں بڑھتا گیا تو وہ اس حد تک پہنچ گئے کہ تختِ سلطانی پر مسلمان سلطان رونق افروز ہونے کے باوجود ملک کی اپنی اصلی حیثیت مفقود ہو گئی۔ اذان، جمعہ، عیدین کے جاری وساری رہنے کے باوجود اس ملک کی شرعی پہچان اور تعریف بدل گئی۔

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''جب کافر کسی اسلامی ملک پر قابض ہو جائیں اور اس ملک اور ملحقہ اضلاع کے لیے یہ ناممکن ہو کہ وہ ان کو اس سے باہر نکال سکیں یا ان کو باہر نکالنے کی کوئی امید باقی نہ رہے، اور کافروں کی طاقت میں یہاں تک اضافہ ہو جائے کہ وہ اپنی مرضی سے اسلامی قوانین کو جائز یا ناجائز قرار دیں، اور کوئی انسان اتنا طاقتور نہ ہو جو کافروں کی مرضی کے بغیر ملک کی مال گزاری پر قبضہ کر سکے، اور مسلمان باشندے اس امن وامان سے زندگی بسر نہ کر سکیں جیسا کہ وہ پہلے کرتے تھے، تو یہ ملک سیاسی اعتبار سے دار الحرب ہو جائے گا۔''[۵]

دوسرے ایک اور فتویٰ میں شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''اور دار الحرب اسی وقت دار الاسلام ہو جاتا ہے کہ اہل اسلام کے احکام اس میں جاری ہو جائیں،
> اور کافی میں ہے:

---

[۵] نقش حیات: خود نوشتہ سوانح، حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، مطبوعہ دار الاشاعت، کراچی پاکستان ۲/۴۱۱-۴۱۰، حاشیہ نمبر-۱

'إن المراد بدار الإسلام بلاد يجرى فيها حكم إمام المسلمين ويكون تحت قهره، وبدار الحرب بلاد يجرى فيها أمر عظيمها وتكون تحت قهره.'

یعنی 'دار الاسلام سے مراد وہ علاقہ ہے جس میں مسلمانوں کے امام کا حکم جاری ہو اور وہ شہر اس کے زیر حکومت ہو، اور دار الحرب سے وہ علاقہ مراد ہے جس میں ان شہروں کے سردار کا حکم چلتا ہو اور اس کے زیر حکومت ہو۔ اس شہر میں مسلمانوں کے امام کا حکم ہر گز جاری نہیں، نصاریٰ کے حکّام کا حکم اور دبدبہ جاری ہے، اور احکام کفر کے جاری ہونے سے یہ مراد ہے کہ مقدمات، انتظامِ سلطنت اور بندوبستِ رعایا، تحصیلِ خراج و باج و عشر واموالِ تجارت میں حکّام بطور خود حاکم ہوں، اور ڈاکوؤں اور چوروں کی سزا، اور رعایا کے باہمی معاملات اور جرائم کی سزا کے مقدمات میں کفار کا حکم جاری ہو، اگرچہ بعض احکامِ اسلام مثلاً جمعہ، عیدین اور اذان اور گائے کے ذبیحے میں کفار تعرض نہ کریں۔'"[٦]

شاہ عبد العزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ان عبارتوں پر ذرا غور کیجیے:

"اس شہر میں مسلمانوں کے امام کا حکم ہر گز جاری نہیں، نصاریٰ کے حکام کا حکم و دبدبہ جاری ہے"

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہہ رہے ہیں کہ حکم نصاریٰ کا چل رہا ہے، اور تاریخ بتاتی ہے کہ اس وقت سلطنتِ دہلی پر مغل بادشاہ شاہ عالم رونق افروز تھے جن کی حکومت ۱۸۰۶ عیسوی تک تھی، یا اکبر شاہ ثانی تخت سلطنت پر تشریف فرما تھے جن کی حکومت ۱۸۰۶ سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مورتی کی طرح غیر ذی روح مسلمان بادشاہ (کے ہونے) سے کوئی ملک دار الاسلام نہیں بن سکتا، اور اگر وہی مورتی جیسا بادشاہ نصاریٰ کی طرف داری کرنے لگے، اپنے تختِ بادشاہی کو گلے سے لگائے رکھنے کے لیے مسلمانوں کے خلاف کفار کی کارروائیوں میں شریک

[٦] فتاویٰ عزیزی، ایچ ایم سعید کمپنی، پاکستان، طبع جدید سنہ ۱۴۰۴ھ، ص: ۴۵۵-۴۴۵

بھی ہو جائے، تو وہ ملک غیر مسلم کے ہاتھ میں تو ہے ہی، مزید فکر کی بات یہ ہے کہ اس بادشاہ کا ایمان بھی اب باقی رہا یا نہیں۔ معاملہ اگر یہاں تک پہنچ گیا تو بادشاہ صورتاً جو مسلمان تھا، وہ بھی شاید نہ رہے گا۔

غرض اس طرح کے مسلمان بادشاہ سے دار دار الاسلام نہیں رہے گا، یہ دار دار الحرب بن جائے گا، محدث دہلوی کا کہنا یہی ہے۔

"اور جرائم کی سزا کے مقدمات میں کفار کا حکم جاری ہو، اگرچہ بعض احکامِ اسلام مثلاً جمعہ وعیدین اور اذان اور گائے کے ذبیحہ میں کفار تعرض نہ کریں"

ان کی اس دوسری بات پر بھی ذرا غور کر کے دیکھیں: اگر کسی ملک میں جرائم کی سزا کے مقدمات غیر شرعی قوانین سے چلتے ہوں، غرض یہ کہ ملک کے آئینی ادارے اگر کفار کے قوانین کے ماتحت ہیں اور شرعی قوانین کے ماتحت نہیں ہیں تو وہ دار دار الحرب ہے، اگرچہ اس ملک میں نماز ادا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، جمعہ وعیدین میں کوئی پریشانی نہ ہو یا اذان جیسا کھلا اسلامی شعار بھی بحال رہے، پھر بھی وہ دار دار الحرب ہے، کیوں کہ غلبہ کفر کا ہے، کفری آئین کی ماتحتی ہے، کفر اور اہل کفر کی اجازت سے بعض اسلامی امور ادا تو ہو جائیں گے، لیکن اس سے کوئی ملک دار الاسلام نہیں بنے گا، دلیل کا یہی فیصلہ ہے۔

اس بارے میں ہندوستان کے اور ایک روشن ضمیر عالم کا فتویٰ بھی دیکھ لیجیے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھا جب ہندوستان رفتہ رفتہ دار الاسلام کی حیثیت کو کھو کر دار الحرب بنتا چلا جا رہا تھا، وہ ہیں مولانا عبد الحئ بڑھانوی۔

مولانا عبد الحئ بڑھانوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> "عیسائیوں کی پوری سلطنت کلکتہ سے لے کر دہلی اور ہندوستان خاص کر ملحقہ ممالک (یعنی شمالی مغربی سرحدی صوبے) تک سب کی سب دار الحرب ہے، کیوں کہ کفر اور شرک ہر جگہ رواج پا چکا ہے، اور ہمارے شرعی قوانین کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ اور جس ملک میں ایسے حالات پیدا

ہو جائیں وہ دار الحرب ہے۔ یہاں ان تمام شرائط کا بیان کرنا طوالت کا باعث ہو گا جن کے ماتحت جملہ فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ کلکتہ اور اس کے ملحقات دار الحرب ہیں۔''[۷]

مولانا بڈھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت پر پھر سے ذرا غور کیجیے جس میں گویا کہ شاہ عبد العزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی بات ہی کو دہرایا گیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

''اور ہمارے شرعی قوانین کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ اور جس ملک میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں وہ دار الحرب ہے۔''

اس میں بھی بات وہی ہے جو ہم پہلے عرض کر رہے تھے، مولانا عبد الحئ بڈھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان کو دار الحرب قرار دینے کے لیے جس سبب اور علت پر خاص طور پر روشنی ڈالی، وہ یہ ہے کہ ہمارے شرعی قوانین کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔

محترم قارئین سے ہماری درخواست ہے، آپ حضرات اس بات کو ذرا ذہن نشین کر لیجیے کہ ہمارے قوانین یعنی شریعتِ اسلامیہ کے قوانین کی جہاں کوئی پروا نہیں، اسلامی قوانین کی جہاں کوئی حیثیت نہیں وہ ملک کبھی دار الاسلام نہیں ہو سکتا، وہ ضرور دار الحرب ہے۔ مجتہدینِ کرام نے یہی بات کہی، ہندوستان کے حالات کا مشاہدہ کرنے والے علمائے کرام نے بھی یہی بات کہی، اور اسی بناء پر اس برِّ صغیر ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا۔

بس اس متفق علیہ اصول و فتاوی کی بناء پر یہ ملک دار الحرب بنا اور دار الکفر قرار پایا، اسی بناء پر علمائے اسلام کی قیادت میں کفار کے خلاف مسلمان لڑتے رہے، اسی بناء پر علماء اور عام مسلمان اللہ کے راستے میں شہید اور غازی کا بابرکت مرتبہ حاصل کرتے رہے، اسی بناء پر ہجرت کا عمل چلتا رہا اور یہ سنت زندہ ہوئی، اسی بناء پر جہاد کی ہر قسم کی تیاریاں چلتی رہیں، اسی بناء پر ہمارے مشائخ و اکابر کی ہر خانقاہ ایک ایک قلعہ کی حیثیت رکھتی تھی، اسی بناء پر قادیانی جیسے

---

[۷] نقش حیات: خود نوشتہ سوانح، حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، مطبوع دار الاشاعت، کراچی پاکستان ۲/ ۴۱۱-۴۱۰، حاشیہ نمبر-۱

زندیقوں اور دوسرے بدعتی فرقوں کے ساتھ ہمارا اختلاف چلتا رہا، اور اسی بناء پر ہمارے اکابر ومشائخ ہم کو جہاد فی سبیل اللہ کی تعلیم دیتے رہے اور تلقین کرتے رہے۔

برِّصغیر ہندوستان اب بھی کیوں دار الحرب ہے؟

جن دو بنیادی باتوں کی بناء پر اور جن دو مرکزی سبب وعلت کی وجہ سے برِّصغیر ہندوستان تقریباً دو سو برس پہلے دار الحرب اور دار الکفر بنا تھا، اب بھی اُسی سبب وعلت کی وجہ سے برِّصغیر ہندوستان دار الحرب اور دار الکفر ہے۔ برِّصغیر ہندوستان پر آج بھی کفار کا تسلط سو فیصد ہے، قانونی ادارے سو فیصد غیر شرعی اور کفری آئین کے ماتحت ہیں، شرعی قوانین کی کہیں کوئی پروا نہیں کی جاتی، برِّصغیر کے اس ملک کا نام چاہے بھارت ہو، بنگلہ دیش ہو، اور چاہے اس ملک کا نام پاکستان ہو۔

بھارت

اگر اس ملک کا نام بھارت ہے تو کتاب کی ہر بات اس ملک کے بارے میں واضح ہے، دار الحرب کا ہر وصف اس پر صادق آتا ہے۔ اس کے حکمران کافر ملعون ہیں، جس کے بارے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں، اس ملک کے آئینی ادارے سو فیصد غیر شرعی قوانین اور کفری آئین کے ماتحت ہیں، اس ملک میں شرعی قوانین کی کہیں بھی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ لہٰذا یہ ملک کتاب وسنت کی رو سے دار الحرب اور دار الکفر ہے، جو کسی بھی مسلمان سے مخفی نہیں، اور مخفی ہونے کی کوئی گنجائش بھی نہیں۔

بنگلہ دیش

اور اگر اس ملک کا نام بنگلہ دیش ہے تو دار الحرب کے دو بنیادی اوصاف اس میں بالکل واضح طور پہ موجود ہیں۔ اس ملک پر کفار کا تسلط سو فیصد ہے، اس ملک کے قانونی ادارے سو فی صد غیر شرعی اور کفری قوانین کے ماتحت ہیں، اس ملک میں شرعی قوانین کی کہیں کوئی پروا نہیں، لہٰذا یہ ملک کتاب وسنت کی رو سے دار الحرب اور دار الکفر ہے۔

بھارت اور بنگلہ دیش میں ایک لحاظ سے ذرا سا فرق ہے، وہ فرق یہ ہے کہ بھارت کے حکمران خود کو غیر مسلم کہتے ہیں، مگر بنگلہ دیش کے حکمران اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں، بنگلہ دیش کے حکمرانوں کا دعویٰ ہے کہ وہ مسلمان ہیں، عوام کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ وہ صرف مسلمان ہی نہیں، بلکہ وہ اسلام کے خیر خواہ و مخلص خادم ہیں۔ اس بارے میں مجھے دو باتیں عرض کرنی ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ جب کوئی حکمران اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرے، لیکن ملک میں وہ کفری آئین اور غیر شرعی قوانین کو نافذ کرے اور رواج دے، شرعی قوانین کے مقابلہ میں غیر شرعی قوانین کو ترجیح دے تو ایسا حکمران دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہی حکم بنگلہ دیش کے حکمرانوں کا ہے، کیونکہ وہ غیر شرعی قوانین کو شرعی قوانین کے مقابلے میں ترجیح دیتے ہیں، غیر شرعی قوانین پر چلنا ہر مسلمان پر واجب کرتے ہیں، شرعی قوانین پر چلنے کو قابلِ سزا جرم قرار دیتے ہیں، اور شرعی قوانین کو نافذ کرنے کے لیے احتجاج کرنے کو دستور کے خلاف شمار کرتے ہیں اور قابلِ سزا جرم قرار دیتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ، بالفرض اگر مان لیا جائے کہ بنگلہ دیش کے حکمران مسلمان ہیں، پھر بھی یہ ملک دار الحرب ہی ہے، کیونکہ یہ حکمران یا تو مجبورِ محض ہیں، جس وجہ سے وہ خود بھی غیر شرعی قوانین پر چلتے ہیں اور کروڑوں مسلمانوں کو غیر شرعی قوانین پر چلنے کے لیے مجبور کرتے ہیں، اور جس حکمران کی یہ حالت ہو وہ کالعدم ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس ملک پر کفر کا تسلط سو فیصد ہے، تو کفر کا تسلط سو فیصد اور قوانین سو فیصد غیر شرعی ہونے کے بعد ملک کے دار الحرب نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں، اور دار الاسلام ہونے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور یا یہ حکمران مجبورِ محض نہیں، سو اگر مجبورِ محض نہیں تو وہ خود مختار ہیں، اور خود مختار ہونے کی صورت میں، خود مختار ہونے کی حیثیت سے جو خود غیر شرعی قوانین کو اپنے لیے قانون بناتا ہے، اور کروڑوں مسلمانوں کو اس غیر شرعی قوانین پر چلنے کے لیے مجبور کرتا ہے، وہ علمائے اسلام کے اتفاق سے دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ اور جب حاکم بھی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے اور قوانین بھی غیر شرعی ہوں، تو یہ دار اور یہ ملک دار الحرب نہ ہو ایسی کوئی صورت نہیں ہے۔ دار الحرب ہونے کی یہ

اصولی باتیں ہوتے ہوئے ہزاروں صورتیں نکل سکتی ہیں، لیکن وہ دار دار الحرب کے حکم سے خارج نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ملکِ بنگلہ دیش کے دار الحرب ہونے میں ہمیں کوئی شک نہیں۔

پاکستان

اور اگر اس ملک کا نام پاکستان ہے تو دار الحرب کے مرکزی (اصولی) دو اوصاف اس میں بھی بالکل واضح طور پہ پائے جاتے ہیں۔ درحقیقت پاکستان اور بنگلہ دیش میں طرزِ حکمرانی اور اصولِ قانون سازی میں کوئی فرق نہیں۔ جتنا فرق ہے وہ ہم ان شاء اللہ آگے بتائیں گے۔ پاکستان کے حکمرانوں کی ایمانی حالت کیا ہے؟ اسے سمجھنے کے لیے آپ بنگلہ دیش کے حکمرانوں کے حالات پر دوبارہ نظر ڈالیے۔ آپ پاکستان کے حکمرانوں کے حالات کا مطالعہ کریں گے تو آپ کے سامنے یہ حقیقت واضح طور پر اجاگر ہو جائے گی کہ ابتدائی حکمرانوں سے لے کر آج کل کے پرویز، نواز، عمران تک...... کوئی حکمران، کوئی صدر اور کوئی وزیر اعظم ملک کے قوانین کے لیے شرعی قوانین کو ضروری نہیں سمجھتا، اور نہ پاکستان کا کوئی حکمران شرعی قوانین کو کفری قوانین پر ترجیح دیتا ہے۔

آپ اگر صفحاتِ تاریخ کو الٹنے کی ذرا ہمت کریں تو دیکھیں گے کہ قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک کے ہر حکمران نے قرآن و حدیث کے شرعی قوانین کے مقابلے میں قانونِ وضعی اور انگریز کے کفری قوانین ہی کو ترجیح دی، اور کروڑوں مسلمانانِ پاکستان کے لیے شرعی قوانین کے مقابلے میں غیر شرعی قوانین کو (ہی) زیادہ مفید اور مناسب سمجھا۔

آج کا یہ ملکِ پاکستان جب وجود میں آیا اس وقت سے لے کر آج تک وہاں شرعی قانون نافذ نہیں ہوا، آج بھی وضعی اور کفری قانون ہی اپنی پوری آن بان اور شان کے ساتھ یہاں نافذ ہے اور اپنی پوری طاقت اور جوش کے ساتھ وہاں کارگر ہے۔ یہ کیوں ہوا؟ اور کیسے ہوا؟ یا تو آپ یہ کہیں گے کہ پاکستان کے حکمران مجبورِ محض تھے اور اب بھی مجبورِ محض ہیں، یا یہ کہیں گے کہ وہ خود مختار ہیں، جو بھی کہیں گے نتیجہ وہی نکلے گا جو آپ بنگلہ دیش کے حق میں ابھی دیکھ چکے ہیں۔

اس موقع پر آپ حضرات کو میں دوبارہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ برِّصغیر ہندوستان کو جب دار الحرب قرار دے کر (یہاں فرضیتِ جہاد و قتال کا) فتویٰ دیا جا رہا تھا...... اس وقت اس ملک کے تختِ حکمرانی پر مسلمان سلطان تشریف فرما تھے، پھر بھی دار الحرب ہونے کا فیصلہ ہو گیا تھا، وجہ یہی تھی کہ تسلط کفر کا تھا اور قوانین کفری اور غیر شرعی تھے۔

لہٰذا پاکستان کے موجودہ حکمران اگر بالفرض مجبورِ محض ہیں تو وہ ان کے کالعدم ہونے اور سو فیصد کفر کے تسلط کی وجہ سے پاکستان دار الحرب ہے، اور اگر وہ ان امور (شرعی اور غیر شرعی قوانین کے نفاذ) میں مختار ہیں تو وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ سو جب پاکستان کے حکمران بھی دائرۂ اسلام سے خارج ہوئے اور قوانین بھی غیر شرعی ہیں، تو لا محالہ یہ دار، دار الحرب ہے، اس میں تیسری کوئی صورت نہیں۔

دار الحرب ہونے کے اعتبار سے پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان فرق

فقہائے مجتہدین نے کسی بھی ملک کے دار الحرب ہونے کے لیے، کتاب و سنت سے جو دو مرکزی اور بنیادی شرطیں مستنبط کی ہے، وہ دونوں شرطیں بنگلہ دیش اور پاکستان میں برابر پائی جاتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دستورِ پاکستان کے دیباچے اور مقدمے میں کچھ ایسی باتیں ہیں جو دستورِ بنگلہ دیش کے مقدمے میں نہیں ہیں۔

ان باتوں کی تفصیل میں جانا ہمارا مقصد نہیں، البتہ بقدرِ ضرورت کچھ عرض کر دیں گے ان شاء اللہ، تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ دستورِ پاکستان کے دیباچے اور مقدمے میں دستورِ بنگلہ دیش سے زائد جو باتیں ہیں ان کی وجہ سے کوئی ملک، دار الاسلام نہیں بن سکتا، اور نہ ہی ان باتوں سے پاکستان کو دار الاسلام بنانا، اس کے حکمرانوں کا مقصد ہے۔

یہاں اوپر کی اس عبارت میں ہم نے چھوٹے سے دو دعوے کیے:

پہلا دعویٰ یہ ہے کہ دستورِ پاکستان کے دیباچے اور مقدمے میں دستورِ بنگلہ دیش سے جو زائد باتیں ہیں، ان باتوں سے پاکستان دار الاسلام نہیں بن سکتا۔

اور دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ ان باتوں سے پاکستان کو دار الاسلام بنانا، پاکستان کے حکمرانوں کا مقصد بھی نہیں۔ ہمارے ان دونوں دعووں کے بارے میں تفصیلی باتیں کرنا اس مضمون میں ذرا مشکل ہے۔ بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ اس لیے مختصر طور پر غیر مرتب دو چار باتیں عرض کرتے ہیں:

١. دستورِ پاکستان کے دیباچے کی ان باتوں میں اس بات کا اعلان نہیں ہے کہ پاکستان کے آئینی ادارے قرآن و حدیث کے ماتحت چلیں گے۔
٢. ان باتوں میں اس بات کا اعلان نہیں ہے کہ پاکستان کی عدالت، شرعی قوانین کے ماتحت چلے گی۔
٣. قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک پاکستان میں ایک دن کے لیے بھی شرعی قانون نافذ نہیں ہوا۔
۴. قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک مسلمانوں کی طرف سے شرعی قوانین کے نفاذ کے لیے احتجاج جاری ہے، جس سے یہ حقیقت بار بار منظر عام پر آچکی ہے کہ پاکستان کی عدالت اور پاکستان کے قوانین شرعی قوانین نہیں ہیں، وہاں کی عدالتوں میں قرآن وحدیث کی ماتحتی نہیں ہے۔
۵. پاکستان کے ابتدائی حکمرانوں نے شرعی قانون کو ملک کا قانون نہیں بنایا، پاکستان کے اکابر میں سے شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر تمام اکابر پاکستان میں شرعی قوانین کو ملک میں قانونی حیثیت دینے کے لیے مسلسل احتجاج کرتے رہے، اور حکمرانوں کی طرف سے اس کا قولی اور عملی طور پر انکار بھی مسلسل ہوتا رہا۔

یہ امور اس بات کی کھلی دلیل ہیں کہ بنگلہ دیش اور پاکستان میں حکم کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں، کسی ملک کے دار الحرب ہونے کے لیے جن اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے، وہ سب پاکستان میں موجود ہیں۔

سو دلیل کے اعتبار سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ جن وجوہ سے دو سو برس پہلے برّصغیر ہندوستان دار الحرب بنا تھا، انہی وجوہ کی بناء پر یہ ملک آج بھی دار الحرب ہے، چاہے اس کا نام بھارت ہو، یا بنگلہ دیش ہو یا پھر پاکستان۔ اس ملک یعنی برِّ صغیر ہندوستان (یعنی بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان) کے دار الحرب بننے کے بعد دار الاسلام بننے کا کوئی مرحلہ اس پر

سے نہیں گزرا۔ کسی بھی دار الحرب کے دار الاسلام میں تبدیل ہونے کے لیے جو باتیں ضروری تھیں، وہ اس خطۂ ارض کو نصیب نہ ہوئیں۔

اب ہم ان مراحل کی مختصر کہانی آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جن سے یہ برِّصغیر گزشتہ دو سو برس میں گزرا ہے، لیکن دار الاسلام بننے کا کوئی مرحلہ اس دوران نہیں آیا۔ ہزاروں تبدیلیاں ہوئیں، لیکن دار الاسلام ہونے کے لیے جو تبدیلی ضروری تھی، وہ اس خطے کو نصیب نہ ہوئی۔ اگلے صفحات میں اسی کہانی کو ہم مختصراً پیش کرتے ہیں۔ اللہ توفیق عطا فرمائے۔

ہندوستان: دار الحرب بننے سے ماضی قریب تک

علمائے ہند کا کردار

یہ ملک یعنی برِّ صغیر [ہندوستان (بھارت)، بنگلہ دیش اور پاکستان] دارالحرب بننے کے بعد دارالاسلام بننے کے مرحلے میں کبھی داخل نہیں ہوا، کہ دارالحرب سے دارالاسلام میں تبدیل ہونے کے لیے جو باتیں ضروری تھیں وہ اس خطۂ ارض کو نصیب نہیں ہوئیں۔

گزشتہ دو سو برس میں برِّ صغیر بہت سے مراحل سے گزرا اور ہزاروں تبدیلیاں اس میں آئیں، مگر ان میں سے کوئی تبدیلی بھی اسے دارالاسلام بنا دینے والی نہ تھی۔ دو سو برس کے اس سفر کو ہم مختصراً بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اللہ درست بات کی توفیق عطا فرمائے۔

ہم پر کیا گزری؟

ہندوستان (یعنی برِّ صغیر پاک وہند اور بنگلہ دیش) گزشتہ دو سو برس کے دوران ایسے ایسے مراحل سے گزرا کہ جن کا تصور بھی آج کے مسلمان کے لیے مشکل ہے، اور ایسا ہی حال ہر ماضی کا ہوتا ہے کہ حال کا آدمی جتنا بھی پڑھ لے اور جہاں تک بھی تصور کے گھوڑے دوڑائے وہ مشاہدہ کرنے والے کے احساس کو نہیں پا سکتا۔ بدلتے احوال کا ادراک، ماضی اور حال کا فرق اس دور سے گزرنے والا جیسے کر سکتا ہے اس طرح اس دور سے غیر حاضر فرد نہیں کر سکتا۔

اسی طرح جن لوگوں نے اپنے مقتول والدین، بھائی بہنوں رشتہ داروں کے خون سے رنگے چہرے ان کے قاتلین کے ہاتھوں میں دیکھے، ان کا جذبۂ انتقام اور بدلے کا عزم ان کے برابر ہرگز نہیں ہو سکتا جنہوں نے اس قتل و قتال کی محض کہانیاں سن رکھی ہیں اور انہیں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔

اسی طرح باپ دادا سے میراث میں ملی جائیداد اور اپنی محنت سے بنائے مکان کی محبت یکساں نہیں ہو سکتی، اپنے خون پسینے کی کمائی کی قدر و قیمت ہرگز مفت ملے عطیے کے برابر نہیں ہو سکتی۔

گندے ماحول میں رہنے بسنے والا اس ماحول کی گندگی اور بدبو سے وہ اذیت محسوس نہیں کرتا جتنا کہ پاکیزہ ماحول سے اس گندگی اور تعفن بھرے مقام پر آنے والا محسوس کرتا ہے۔ مگر پاکیزہ ماحول سے آنے والے کی یہ تکلیف اور اذیت بھی رفتہ رفتہ دور ہوتی جاتی ہے، بدبو کا احساس ختم ہو جاتا ہے...... کیوں؟ کیا بدبو دور ہو گئی یا اس شخص نے بدبو کو اپنالیا؟ حقیقت یہ ہے کہ بدبو تو اپنی اسی شدت کے ساتھ قائم و دائم ہے، ماحول بھی متعفن ہے اور گندگی بھی پھیلی ہوئی ہے، لیکن صاحبوں نے اس بدبو کو اپنالیا ہے۔

ان چند تمہیدی نکات کے بعد اب ہم ہندوستان کی مختصر کہانی کی جانب آتے ہیں۔ یہ کوئی باقاعدہ تاریخی مضمون نہیں ہے کہ جس میں ماضی کے ہر گوشے کو اجاگر کیا جائے، بلکہ ہم یہاں صرف تاریخ کے ان حصوں پر روشنی ڈالیں گے جن سے صدیوں پر محیط پیچیدگیوں کو حل کرنے میں مدد ملے۔ قوم پرستی کی جہالت، عصبیت پر مبنی نفرت، اور فرقہ وارانہ عداوت سے پاک ہو کر محض ایک مسلمان کی حیثیت سے تاریخ کی جن باتوں کو سامنے لانا اور جن حالات پر غور کرنا مطلوب ہے ہم صرف انہی کا احاطہ کرنے کی کوشش کریں گے، ان شاء اللہ۔ دو سوا دو صدیوں پر محیط اس تاریخ کو ہم چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

- پہلا حصہ: ہندوستان دارالحرب بننے سے مغل سلطنت کے خاتمے تک، یہ قریباً پچاس سالہ مدت ہے۔
- دوسرا حصہ: مغل سلطنت کے اختتام سے آزادئ ہند اور قیام پاکستان تک، یہ قریباً ایک صدی پر محیط عرصہ ہے۔
- تیسرا حصہ: آزادئ ہند اور قیام پاکستان سے لے کر تقسیم پاکستان اور قیام بنگلہ دیش تک، جو لگ بھگ تیئس چوبیس برس پر محیط ایک مختصر مدت ہے۔
- چوتھا حصہ: تقسیم پاکستان اور قیام بنگلہ دیش سے لے کر اب تک، یہ قریباً پچاس سال کا عرصہ ہے۔

پہلا حصہ: فتویٰ دار الحرب سے مغل سلطنت کے خاتمے تک (۱۸۰۸ء تا ۱۸۵۷ء)

انیسویں صدی کا آغاز، جب ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ دیا گیا، یہ وہ دور تھا کہ جب مسلمانوں کا وجود تو تھا لیکن ان کے پاس طاقت نہ تھی، تختِ سلطانی مسلمانوں کے پاس تھا مگر سلطانی نہ تھی۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے فتوے کی حتمی تاریخ بتانا تو مشکل ہے البتہ تاریخ دان ۱۸۰۸ء سے ۱۸۱۲ء کے دوران اس کی تاریخ بتاتے ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> ”۱۸۰۳ء میں جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندے نے شاہِ دہلی سے ملکی انتظام کا پروانہ جابرانہ طریقے سے لکھوا کر ملک میں اعلان کر دیا کہ خلق (مخلوق) خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا اور حکم کمپنی بہادر کا، تو شاہ عبد العزیزؒ نے ہندوستان کے دار الحرب ہو جانے کا فتویٰ جاری فرمایا اور مسلمانوں کو آزادیٔ ہند کے لیے آمادہ کرنا ضروری سمجھا[8]۔ واقعات نے بتلا دیا تھا کہ ہندوستان کے موجودہ حکام و امراء میں سے اب کسی میں طاقت اس بدیسی غیر مسلم قوم کے مقابلے اور دفع کرنے کی ایسی نہیں رہی جس پر اطمینان کیا جائے۔ لہٰذا مسلمانوں کے لیے احوال پر غور کرنا اور آزادی کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ازبس ضروری ہے جو کہ ہر دار الحرب کے باشندے پر لازم ہے۔ چنانچہ اس کے بعد سے جدوجہد شروع ہوئی۔“[9]

مذکورہ فتوے کے اجراء کے قریباً پچاس سال بعد ہندوستان میں مغل حکومت کا خاتمہ ہوا اور ۱۸۵۷ء میں مغل سلطنت کے آخری فرمانروا سلطان بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی کے ساتھ ہندوستان سے بادشاہت کا جنازہ نکلا۔ ان پچاس برس کے دوران تخت سلطانی مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا، دہلی کا لال قلعہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا لیکن ہندوستان

---

[8] مذکورہ مفصل فتویٰ فتاویٰ عزیزی میں موجود ہے۔
[9] نقشِ حیات ص ۴۱۰، ۴۱۱

پھر بھی دارالحرب تھا، مغل سلطنت کے باوجود ہندوستان دارالحرب تھا، صدیوں سے مسلمانوں کے ہاتھوں میں سلطنت رہنے کے باوجود دارالحرب بن گیا!

ناقابل ذکر اختلافات رکچھ الحادکچھ زلات

اس موقع پر قارئین کی توجہ ایک بات کی جانب دلانا چاہتا ہوں، بات یہ ہے کہ اس عرصہ میں ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے بارے میں بعض نے اختلاف بھی کیا۔ اسی طرح مغل سلطنت کے بعد کے دور میں جب حکومت صد فی صد کفار کے ہاتھ میں تھی، اس وقت بھی بعض لوگوں نے، قادیانیوں اور ان جیسے کچھ دیگر فرقوں نے بھی اس مسئلے میں اختلاف کیا اور کرتے رہے، دنیا میں کون سا ایسا مسئلہ ہے جس میں کسی کو اختلاف نہ ہو! غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اختلاف کرنے والے نے دلیل کی رو سے اختلاف کیا یا اپنی عصبیت اور نفاق اور الحاد کی بنا پر یا کسی شبہہ کی بنیاد پر۔ اگر کسی شبہہ کی بنیاد پر اختلاف کیا تو وہ معذور ہے اور اگر نفاق اور الحاد کی بنا پر اختلاف کیا تو وہ ملعون ہے، قابل ملامت ہے۔

ہندوستان کے حق پرست علمائے کرام اس پر متفق تھے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں برِّصغیر پاک وہند دارالحرب بن گیا تھا۔ کتاب و سنت کی رو سے یہی فیصلہ درست تھا۔ پھر بھی نفاق، الحاد اور زندقہ کی گرفت میں پھنسے لوگ اس کے دارالاسلام ہونے کا واویلا کرتے تھے اور انگریز سرکار کی جانب سے ان کو ایسا امن اور راحت میسر تھی جو اسلامی سلطنت کے دور میں بھی ان کو کبھی نہ ملی تھی۔ ان لوگوں کی نظر میں انگریز کے خلاف جہاد کرنا فساد اور فتنہ تھا اور کفار کی اطاعت ان کے نزدیک واجب تھی۔ ان ملحدین اور زنادقہ کی سوچ وفکر اور ان کے اقوال کی جانب توجہ کرنے کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ ہی گنجائش۔ البتہ اہلِ حق علمائے کرام میں سے بھی بعض کے قلم کی نوک سے کچھ ایسی باتیں نکل گئیں جو دلیل کی رو سے غلط اور علمائے وقت کے اجماع کے خلاف تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے ہندوستان کے دارالحرب بن جانے کا جو فتویٰ جاری فرمایا اسی پر ہندوستان کے حق پرست علماء عمل پیرا ہوئے اور ہندوستان پر متسلط کفار کے خلاف جہاد شروع کیا اور اپنی محدود طاقت و وسائل کے باوجود انگریز کے

خلاف جہاد کرتے رہے، قربانیاں دیتے رہے، اللہ کے راستے میں شہید ہوتے رہے، اللہ کے دشمنوں کو مارتے رہے اور اپنا فرض ادا کرتے رہے۔

ادائے فرض کا ایک قابلِ اقتداء نمونہ

دارالاسلام، جو غیر اسلامی تسلط کی وجہ سے دارالحرب بن گیا تھا، کو دوبارہ حاصل کرنے اور غیر اسلامی اقتدار ہٹانے کے لیے اللہ کے راستے میں جہاد کا جو تسلسل شروع ہوا تھا، معرکۂ بالاکوٹ اسی کی ایک ناقابل فراموش کڑی ہے۔ رائے بریلی کے سیّد خاندان کے یکتائے روزگار مرشد کامل، مجاہد ملت سیّد احمد بریلوی شہیدؒ کی امارت اور ان کے بے مثال سپہ سالار مولانا اسماعیل شہیدؒ کی قیادت میں متسلط قوت کے خلاف جہاد کا سلسلہ شروع ہوا۔

سیّد احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ ہی کے دربار کے پروردہ ہیں۔ آپ اگر تاریخ کے صفحات پر نگاہ دوڑائیں تو آپ دیکھیں گے کہ ہمارے اسلاف کے مراکز علمی سے جس طرح تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری و ساری رہا اسی طرح وقت کی دیگر شرعی ذمہ داریاں بھی یہی مراکز انجام دیتے رہے۔ چنانچہ اسی مرکز علمی سے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ جاری کیا گیا، اسی مرکز علمی سے جہاد کا آغاز ہوا اور انہی مراکز علمی سے نکلنے والے علم و عمل کے شہ سوار اسلامی حکومت دوبارہ قائم کرنے اور متسلط قوتوں کو ہٹانے کے لیے آخری دم تک لڑتے رہے یہاں تک کہ اس راستے میں اپنے گلے کٹوا دیے۔

مختصراً اس وقت حالات یہ تھے کہ ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا جاچکا تھا، ملک کے حکمران مسلمان تھے، تسلط کفار کا تھا، آئینی ادارے کفار کے قوانین کے ماتحت چلتے تھے، متسلط قوت دنیا کی سب سے بڑی مسلح فوج کی مالک تھی، عام مسلمانوں میں جہالت و گمراہی وبا کی طرح پھیلی ہوئی تھی، نفاق و الحاد کا جال بچھا ہوا تھا، ہر قسم کی سازشوں کے پھندے گھیرے ہوئے تھے، دین کے تمام جلی و قطعی شعبوں کو مشکوک اور مختلف فیہ بنانے کا منصوبہ پختہ ہو چکا تھا، اسلام کے دشمن کفار محاربین کی بہبود اور ان کے قدم چومنے کے لیے ایمان فروشوں کی ایک بڑی جماعت اپنے ایمان کا سودا کر چکی تھی، علمائے سوء اور الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ (دینی نصوص میں معنوی تحریف کرنے

والوں) کی ایک بڑی تعداد تحریف اور تاویل کا بازار گرم کیے ہوئے تھی، جہادی جدوجہد کے خلاف پروپیگنڈہ جاری تھا، ملکی اور غیر ملکی دشمنوں کی تعداد اور قوت کا اندازہ لگانا بھی مشکل تھا جبکہ دوسری جانب مجاہدین تھے، دونوں فریقوں کی تعداد اور قوت میں سرے سے کوئی تناسب نہ تھا۔ محض ایک معرکۂ بالاکوٹ پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ مسلمان مجاہدین کی تعداد سات سو جبکہ دشمن کی تعداد دس ہزار تھی۔ تاریخ پر نظر ڈالیں تو اسلام اور کفر کے مابین معرکوں میں فریقین کا عددی تناسب کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا، مگر مسلمان جب بھی اپنے رب کے بھروسے اور ایمانی طاقت کے بل پر لڑا، وہ کامیاب ہوا۔

بانیانِ دارالعلوم دیوبند کا اقدام

متسلط انگریز کے خلاف ہمارے اکابر و اسلاف جہاد کے لیے جتنے میدانوں میں بھی اترے ان میں سے ہر ایک کا یہی حال تھا مگر پھر بھی انہوں نے اپنی شرعی ذمہ داری سے روگردانی نہ کی۔ میدان بالاکوٹ کی جو تصویر آپ کے سامنے پیش کی، اس کے تقریباً پچیس برس بعد شاملی کے میدان میں بھی عین وہی منظر نظر آتا ہے۔

ہمارے اکابر علمائے دیوبند، جن کو صف اول کے اکابر سمجھا جاتا ہے، مختصر سامان جہاد کے ساتھ مخالف مسلح فوج کی ان گنت تعداد کے خلاف میدان میں اتر گئے کیونکہ مسئلہ دفاع کا تھا۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی امارت، قاسم نانوتویؒ کی سپہ سالاری، رشید احمد گنگوہیؒ بطور قاضی اور دیگر کئی علمائے کرام کی شرکت کے باعث یہ معرکۂ جہاد بپا ہو سکا۔

۱۸۵۷ء میں جب علمائے ہند نے دہلی کی جامع مسجد میں غاصب انگریز کے خلاف جہاد کا متفقہ فتویٰ صادر فرمایا تو اس فتوے پر غور کرنے کے لیے تھانہ بھون میں علماء کی مجلس شوریٰ طلب کی گئی۔ موضوع بحث وہی تھا کہ موجودہ حالات میں ہم ظالم و جابر انگریز سے ٹکر لے سکتے ہیں یا نہیں، اور اس وقت جہاد کا شرعی حکم کیا ہے۔ اجلاس میں شوریٰ نے متفقہ طور پر دہلی کے علماء کے فتویٔ جہاد کی توثیق و تصدیق و تائید کی۔ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہم اللہ تعالیٰ سب موجود تھے، صرف ایک بزرگ حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ کی رائے مخالف رہی، اس اجلاس کا ایک دل چسپ مکالمہ ملاحظہ فرمائیں:

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے حضرت شیخ محمد صاحب سے خطاب کرتے ہوئے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا: حضرت! کیا وجہ ہے کہ آپ ان دشمنانِ دین و وطن کے خلاف جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے؟

حضرت مولانا شیخ محمد صاحب: اس لیے کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں ہیں، ہم بالکل بے سر و سامان ہیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب: کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے جتنا سامان غزوۂ بدر میں تھا؟

حضرت مولانا شیخ محمد صاحب: اگر آپ کی تمام حجتیں اور باتیں مان لی جائیں تو سب سے بڑی شرط جہاد میں نصب امام کی ہے۔ امام کہاں ہے کہ اس کی قیادت میں جہاد کیا جائے؟

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب: نصب امام میں کیا دیر لگتی ہے، مرشد برحق حضرت حاجی صاحب موجود ہیں، انہی کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی جائے۔

حضرت حافظ ضامن صاحب نے فرمایا: مولانا بس سمجھ میں آگیا، پھر سب نے حضرت حاجی صاحب کے دست حق پر بیعتِ جہاد کی۔"[10]

جہاں ایک طرف یہ واقعہ تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے وہیں دوسری طرف ہمارے متنازع فیہ مسئلے کا ایک مدلل اور کافی شافی جواب بھی ہے۔

[10] نقش حیات از مولانا حسین احمد مدنیؒ، ص: ۵۵۲، ۵۵۱

نزہۃ الخواطر پر ایک نظر

علامہ عبد الحیؒ اپنی مشہور کتاب نزہۃ الخواطر میں لکھتے ہیں:

وثار المسلمون وأهل البلاد على الحكومة الإنجليزية سنة أربع وسبعين ومائتين وألف، وقامت جماعة من العلماء والصلحاء وأهل الغيرة من المسلمين في سهارنبور ومظفر نكر فأعلنوا الحرب على الإنكليز واختاروا الشيخ إمداد الله أميراً لهم، واشتبك الفريقان في ميدان شاملي قرية من أعمال مظفر نكر فقتل حافظ محمد ضامن شهيداً، وانقلبت الدائرة على المسلمين ورسخت أقدام الإنكليز. واشتد بطشهم بكل من اتهم بالمشاركة في هذه الثورة، وضاقت على العلماء العاملين الغيارى الأرض، وضاق مجال العمل في الهند، وقضى بعض الرفقة مدة في الاختفاء والانزواء، ولجأ بعضهم إلى الهجرة ومغادرة البلاد، وآثر الشيخ إمداد الله الهجرة إلى مكة المكرمة، ودخل مكة سنة ست وسبعين ومائتين وألف وألقى رحله بالبلد الأمين، وكان أول إقامته على الصفا ثم انتقل إلى حارة الباب حيث قضى حياته ولقي ربه.[11]

''مسلمانانِ ہند نے ۱۲۷۴ہجری میں انگریز حکومت کے خلاف بغاوت کی اور علماء و صلحاء اور غیرت مند مسلمانوں کی ایک جماعت سہارن پور اور مظفر نگر میں جمع ہوئے اور انگریز کے خلاف جہاد کا اعلان کیا اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی صاحب کو اپنا امیر بنایا۔ ضلع مظفر نگر کی ایک آبادی شاملی کے میدان میں فریقین کے درمیان مقابلہ ہوا اس میں حافظ ضامن صاحب نے شہادت پائی، مسلمانوں کی حالت کمزور ہوگئی، انگریزوں کے قدم راسخ ہوگئے۔

ان لوگوں کے خلاف انگریز کی گرفت سخت ہوتی گئی جنہوں نے اس انقلاب میں شرکت کی۔ جہاد کے کام کرنے والے غیرت مند علماء پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی اور ہندوستان میں کام کا میدان تنگ ہونے لگا۔ بعض لوگ کچھ عرصے کے لیے روپوش ہوگئے اور بعض نے ہجرت کی راہ اختیار کی۔ حاجی امداد اللہ نے مکہ مکرمہ کی جانب ہجرت کو ترجیح دی۔ آپ ۱۲۷۶ہجری میں مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور

---

[11] نزهة الخوطر لعبد الحي الحسني المتوفى سنة ١٣٤١هـ، ص: ١١٩٤، دار ابن حزم بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٠هـ-١٩٩٩ء

بلدِ امین میں مقیم ہو گئے۔ آپ پہلے صفا پر اقامت پذیر ہوئے اس کے بعد حارۃ الباب میں منتقل ہو گئے اور وہاں رہتے ہوئے اپنے رب سے جا ملے۔"

خلاصہ

ہندوستان کی گزشتہ دو سوا دو صدیوں پر محیط تاریخ کا جو مختصر جائزہ ہم پیش کر رہے ہیں اس کے پہلے حصے کے مطالعے سے جو باتیں سامنے آتی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱. شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے فتویٔ دار الحرب کے اجراء سے لے کر مغل سلطنت کے خاتمے تک ہندوستان مسلسل دار الحرب ہی رہا۔ اس عرصہ میں یہ کبھی دوبارہ دار الاسلام نہ بن سکا۔

۲. تقریباً پچاس سالہ اس مدت میں ہندوستان کے تختِ سلطنت پر مسلمان رونق افروز رہے اس کے باوجود یہ دار الحرب ہی رہا۔ اکابر علمائے ہند اسے دار الحرب ہی سمجھتے تھے۔

۳. اس پچاس سالہ مدت میں متسلط کفار کے خلاف مسلمانانِ ہند علمائے کرام کی قیادت میں لڑتے رہے، جہاد کرتے رہے۔

۴. بانیان دار العلوم دیوبند نے ان جہادی معرکوں کے ایک بڑے حصے کی قیادت کی ذمہ داری ادا کی اور تعلیم و تعلم سے متعلق جملہ امور کی انجام دہی کے دوران بھی ان کے اندر انگریز کے خلاف جہاد کی فکر مسلسل دکھائی دیتی رہی۔

۵. اپنے سے کئی گنا بڑی، باقاعدہ اور مسلح فوجی قوت کے خلاف وہ انتہائی کم قوت اور تیاری کے باوجود میدان میں اترے۔ سامان کی قلت، افرادی قوت کی کمی اور بعض علماء کا اختلاف بھی ان کو ان کے فرائض منصبی کی ادائیگی سے نہ روک سکا کہ ان کے نزدیک ادائے فرض نہایت اہم تھا۔

۶. ظاہری ناکامی کے بعد بھی جہاد کی فکر کو انہوں نے ذہنوں سے نہیں نکالا بلکہ اسی فکر کی خاطر وہ روپوش ہوئے، اسی جہاد کو جاری رکھنے کے لیے انہوں نے ہجرتیں کیں، جلاوطن ہوئے، سزائیں قبول کیں، شہادت سے ہمکنار ہوئے مگر کسی حالت میں بھی کفار سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

۷. ہندوستان اب تک دارالحرب ہے، دارالاسلام بننے کی کوئی علت تاحال سامنے نہیں آئی۔

دوسرا حصہ: مغل سلطنت کے خاتمے سے آزادیٔ ہند اور قیامِ پاکستان تک (۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء)

اب ہندوستان سے مغل سلطنت کا خاتمہ ہوچکا تھا، نام ہی کی سہی جو سلطنت باقی تھی اب وہ بھی نہ رہی۔ ۱۸۵۷ء میں عام خونریزی اور جلاوطنیوں کے بعد انگریز مطمئن ہوگئے کہ ان کے مقابلے میں اب ایسی کوئی طاقت باقی نہیں رہی جو ان کے اقدام کو روک سکتی ہے۔ مغل سلطنت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کرکے رنگون جلاوطن کردیا، مسلمانوں کے قائدین اور مجاہدین میں کسی کو پھانسی پر لٹکایا اور کسی کو جلاوطنی کی سزا دی، اس طرح انگریز نے اپنے خلاف بغاوت کی تمام ممکنہ جڑیں اکھیڑ دیں۔

اب تک تو انگریز ایک کمپنی کے عنوان کے تحت اپنی ساری کارروائیاں جاری رکھے ہوئے تھا، لیکن ۱۸۵۷ء کی غارت گری کے بعد انگریز اپنے آپ کو کامیاب سمجھنے لگا، اس موقع پر ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کے سے براہ راست برطانوی راج کو منتقل ہوگئی۔ ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریا نے ہندوستان کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور تبھی ہندوستان سرکاری طور پر برطانوی راج کے ماتحت منتقل ہوگیا۔ تقریباً سو برس تک برطانوی راج ہندوستان پر مسلط رہا۔ اس تسلط نے دارالحرب کی حیثیت کو درجۂ متوسطہ سے درجۂ ممتاز تک ترقی دی۔ سرکار برطانیہ نے ایک دارالحرب اور دارالکفر کی حیثیت سے ہندوستان میں کفر ہی کو ترویج دی اور مسلمانوں کے ایمان وعقائد، اعمال وافکار، تعلیم وتربیت کے تمام اجزاء مٹانے کے لیے عملی اقدامات کیے اور جن مراکزِ علمی سے اسلام اور اسلامیت کی تعلیم اور پرچار ہوتا تھا ان سب کو بے اثر اور بے فائدہ بنانے کی کوشش جاری رکھی۔

اب ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلمان قائدین اور مجاہدین اس تمام عرصہ میں کیا کرتے رہے اور اس صد سالہ عرصہ میں ان کی کیا سرگرمیاں رہیں۔ ہم تاریخ کے صرف انہی حصوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کریں گے جو ہمارے موضوع سے متعلق ہیں۔ وباللہ التوفیق۔

رہبرانِ امت کی سرگرمیاں

دہلی کے علماء ومشائخ: دہلی کے ولی اللّٰہی خاندان کا جو عَلَم شاہ اسحاقؒ کے ہاتھ میں تھا وہ ان کے شاگردوں کے ذریعے برابر بلند رہا۔ ان میں شاہ عبدالغنی مجددی، مولانا مملوک علی نانوتوی، میاں نذیر حسین دہلوی اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہم اللہ کے نام سرفہرست ہیں۔

اکابر دیوبند

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد حاجی امداد اللہ صاحب نے مکہ مکرمہ کا رخ فرمایا اور غیر معمولی مشکلات اور پریشانیاں برداشت کرکے مکہ معظمہ میں بیٹھ کر ہی آخر تک ہندوستانی تحریک کی قیادت کرتے رہے۔ [۱۲]

ان کے علاوہ مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا یعقوب نانوتوی رحمہم اللہ اور ان کے ہم عصر و ہم خیال علمائے کرام اپنی اپنی طاقت اور بساط کے مطابق خلافتِ اسلامیہ کی اقامت اور بقا کے لیے کوششیں کرتے رہے۔

یہ ہیں وہ حضرات جن کے ساتھ ہمارا علمی سلسلہ ملتا ہے اور جن کی جدوجہد اور قربانیوں کے صلے میں ہم علم، عمل اور جہاد کے میدانوں سے وابستہ ہوئے۔ ان کے علاوہ ہندوستان کے مختلف خطوں میں مختلف مکاتبِ فکر کے مسلمان آزادئ ہند اور ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے لیے کوششیں کرتے رہے ہیں، ان حضرات کی فہرست بہت طویل ہے اور اس کا احاطہ ممکن نہیں۔

---

[۱۲] علمائے ہند کا شاندار ماضی؛ جلد ۴، ص ۲۸۶

دیگر مجاہدین ملت

سیّد احمد شہید بریلوی کا قافلہ مختلف شعبوں میں تقسیم ہو کر میدان جہاد میں اپنا کردار ادا کرتا رہا۔ مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کے متبعین میں سے علمائے صادق پور نے اپنے علاقوں میں یہ کوشش جاری رکھی، مولانا کرامت علی جون پوری کے متبعین اپنے علاقے میں جدوجہد کرتے رہے، میر نثار الدین تیتومیر کے متبعین اپنے حوصلہ و عزم کے مطابق لڑتے رہے، حاجی شریعت اللہ کے جانشین حضرات اپنی استطاعت کی حد تک اسلامی شریعت کے قیام کو کوششوں میں حصہ ڈالتے رہے، غرض جس کے پاس جو کچھ اسباب و وسائل موجود تھے وہ انہی کو بروئے کار لا کر دشمن کی سرکوبی کے لیے کام کرتے رہے۔

ایک ناقابل انکار حقیقت

یہاں ہمیں ایک حقیقت کو قبول کرنا ہو گا کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بعد ایک طویل مدت تک پورے ہندوستان پر سناٹا سا چھایا رہا۔ جو قافلے اب تک سرگرم تھے اب وہ سابق سرگرمی کے ساتھ منظرِ عام پر نظر نہیں آرہے تھے، دشمن اسلام انگریز مسلمانوں کی جانب سے حملوں کے تھم جانے کے سبب کچھ مطمئن سا ہو چلا تھا، جن خطرات کا انہیں روزمرہ زندگی میں سامنا تھا وہ اب قریباً مٹ چکے تھے۔

لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمان مجاہدین اپنی ذمہ داری بھول بیٹھے تھے کیونکہ بعد کی تاریخ بتاتی ہے کہ کفار کے خلاف بغاوت کی جو چنگاری ان کے سینوں میں دبی ہوئی تھی وہ بجھی نہیں تھی بلکہ حالات کے سنبھلنے تک دبا دی گئی تھی۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ مجاہدین اسلام اس دور میں بے کار بیٹھے تھے، بلکہ وقت کے تقاضے اور ضرورت کے مطابق جو اور جیسی تیاری وہ کر سکتے تھے، کر رہے تھے، بس انہوں نے صرف اپنا طور طریقہ بدل لیا تھا۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس دور میں مجاہدین کا عسکری طور پر خاموشی اختیار کرنا بے سبب نہ تھا اور اس کے لیے انہیں موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ ہاں البتہ اگر عوام کی بھرپور مدد اور حمایت ان کے ساتھ ہوتی اور دیگر مسلم ممالک بھی ہندوستان کو غلامی کے اس دور سے نکلنے میں مدد دیتے تو شاید تاریخ کا چہرہ کچھ اور ہوتا۔

اس موقع پر ایک اور بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ عام مسلمانوں کا دروس ہائے حدیث میں مشغول ہو جانا ایک مستقل دینی خدمت تو ہے لیکن جہاد نہیں، اگر وہ دعوت و تبلیغ کا کام شروع کر دیں تو وہ بھی دینی ضرورت ہے لیکن جہاد نہیں۔ کسی نے اگر اصلاح نفس کی سرگرمیوں میں حصہ ڈالنا شروع کر دیا تو یہ بھی ایک مطلوب دینی امر تو ہے مگر جہاد نہیں ہے، جیسے یہ تمام شعبے جہاد نہیں ہیں ویسے یہ شعبے اپنی عام حالت میں جہاد کی تیاری میں بھی شامل نہیں ہوتے لہٰذا یہ آیت کریمہ وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ کا مصداق بھی نہیں ہیں۔ مگر ہندوستان کے خاص اس دور کے تناظر میں بعد کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ان مجاہدین کی دروس ہائے حدیث میں مشغولیت اور دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تزکیہ کی کوشش دراصل جہاد کے لیے راستے تلاش کرنے کی خاطر ہی تھی، وہ بظاہر ایسی سرگرمیوں میں خود کو مشغول ظاہر کرنا چاہتے تھے جو براہ راست برطانوی راج کو چیلنج نہ کرتی تھیں، بعد ازاں اسی تعلیم و تعلم اور دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں دو تین عشروں کے بعد ایسے کارنامے رونما ہوئے دو تین برسوں کی کوشش سے جن کا بپا ہونا ممکن نہ تھا۔

اکابر علمائے کرام نے علاوہ از جہاد جن عنوانات کے تحت امارت اسلامیہ کے قیام کی خاطر جو کارنامے انجام دیے اور اس راہ میں جو کوششیں کیں ان کا مختصر جائزہ ہم پیش کرنے کی کوشش کریں گے، ان شاء اللہ۔

جہاد شاملی کے بعد

شاملی کے جہاد اور مغل سلطنت کے خاتمہ کے قریباً نو برس بعد میدان شاملی کے کامیاب مجاہد مولانا قاسم نانوتویؒ نے ۱۸٦٦ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔ دارالعلوم میں دیگر علوم کے علاوہ تدریس حدیث کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ اس مدرسہ کے پہلے طالب علم محمود حسن ہیں جو بعد میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے نام سے مشہور ہوئے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی

شیخ الہندؒ نے جہاد اور اقامت خلافت کی راہ میں جو کارنامے سر انجام دیے ان کا فکری سرچشمہ آپ میدان شاملی کے مجاہدین کو قرار دے سکتے ہیں۔ شیخ الہندؒ نے علمی بصیرت، فکری پختگی اور جذبۂ جہاد براہ راست ان حضرات سے لیا

جنہوں نے اپنی تمام طاقت و قوت میدانِ شاملی میں اللہ کے راستے میں پیش کر دی تھی۔ حضرت حاجی صاحب (م۱۸۹۹ء)، مولانا گنگوہی (م ۱۹۰۵ء) اور مولانا قاسم نانوتوی (م ۱۸۸۰ء) رحمہم اللہ، ہر تین حضرات سے مختلف علوم دین سیکھنے کا موقع حضرت شیخ الہند کو ملا جس کی وجہ سے ان کی فکر اور طریق کار میں وہ شبہات اور اشتباہات داخل نہ ہو سکے جو جمہوریت کے فساد اور وطنیت اور عصبیت کی بلا کے ذریعے بعد کے سیاسی افکار میں داخل ہوئے۔

حضرت شیخ الہند نے ۱۸۶۶ء سے ۱۹۰۵ء تک لگ بھگ چالیس سال کی طویل مدت تک ان صالح صحبتوں سے فیض اٹھایا جن کی تشکیل ٹھوس اسلامی خلافت کے قیام کے واحد طریق کار، جہاد اور قتال فی سبیل اللہ کی فکر سے ہوئی تھی، جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے طریقِ کار کے مطابق ڈھلی ہوئی تھیں، یہی وجہ ہے کہ ان شخصیات نے غاصب انگریز جیسی بڑی قوت کے خلاف لڑنے میں کوئی تامل نہ کیا اور بے سروسامانی کی حالت میں بھی اپنے فرض سے غفلت گوارا نہ کی۔

ان صحبتوں کی برکت سے شیخ الہندؒ نے دروس ہائے حدیث، تزکیہ کی خانقاہوں اور دعوت و تبلیغ کے نام سے ۱۸۵۷ء کے بعد کی مدت میں، جسے ہم نے سکتہ کی مدت قرار دیا، اور جو دراصل سکتہ کی مدت نہ تھی بلکہ اس دور میں خفیہ طور پر گوریلا طریق کار سے اقامت خلافت اور جہاد کی تیاری کی جا رہی تھی، اپنا فرض انجام دیا۔

شیخ الہند کا طریق کار

بظاہر سکتہ کی ایک طویل مدت کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کا ظہور ہوا۔ اپنے اکابر کی قربانیوں کے ثمرات حاصل کرنے کے لیے انہوں نے بنیادی طور پر تین سمت پیش رفت کی۔ پہلا ہندوستان کے مسلمانوں کو کفار کے خلاف لڑنے کے لیے تیار کرنا، دوسرا اپنی روحانی اولاد یعنی اپنے شاگردوں میں دین کی اصل روح پھونکنا اور ان کو ان کی ذمہ داریوں اور فرائض سے آگاہ کرنا اور تیسرا دنیا کے تمام مسلم ممالک کو ایک محاذ پر اکٹھا کر کے خلافت عثمانیہ کی اعانت اور کفار کے خلاف جہاد پر آمادہ کرنا۔ گویا یہی وہ میراث تھی جو آپ کو اپنے اکابر سے ملی اور یہی وہ چنگاری تھی جس سے آپ نے جہاد کی شمع جلائی تھی۔

شیخ الہند نے اپنے تینوں منصوبوں میں سے اول الذکر کے لیے آزادئ ہند اور دوسرے کے لیے جمعیت الانصار کے عنوان کے تحت کام شروع کیا جب کہ تیسرے منصوبے کے لیے بیرونی ممالک کے سفر کیے۔ ان تینوں منصوبوں کا اجمالی خاکہ مختصراً ملاحظہ فرمایئے۔

نزہۃ الخواطر کا بیان

شیخ الہند کے ان تینوں منصوبوں کا ایک اجمالی خاکہ آپ کو نزہۃ الخواطر کی اس جامع عبارت میں ملے گا:

وكان قد وضع خطة لتحرير الهند من حكم الإنجليز، كان يريد أن يستعين فيها بالحكومة الأفغانية والخلافة العثمانية، وهيأ لها جماعة من تلاميذه وممن يثق بهم من أصحابه، وكان في مقدمتهم المولوي عبيد الله السندي، وأرسله إلى أفغانستان، وكان الاتصال بينه وبين تلاميذه وأصحابه في الحدود الشمالية وفي أفغانستان، ولما تم لهم بعض ذلك ومهدوا الأرض للثورة واشتدت عليه الرقابة في الهند سافر إلى الحجاز سنة ثلاث وثلاثين وثلاثمائة وألف، وأقام بمكة وقابل غالب باشا الوالي التركي سراً، ثم سافر إلى المدينة المنورة وقابل أنور باشا وزير الحربية وجمال باشا القائد العام للجيش العثماني الرابع حين زار المدينة المنورة، وفاوضهما في طرق إعانة المسلمين في الهند ونفي الإنجليز منه، وأخذ منهما رسالة سرية إلى الشعب الهندي، والوعد بتأييد القضية الهندية، وحمل أهل الهند على مساعدة الشيخ محمود حسن والاعتماد عليه، وأخذت

”حضرت شیخ الہند نے ہندوستان کو انگریز کے قبضے سے چھڑانے کے لیے ایک منصوبہ ترتیب دیا تھا، ان کا ارادہ اس سلسلے میں افغان حکومت اور عثمانی خلافت سے مدد لینے کا بھی تھا، اس کے لیے انہوں نے اپنے شاگردوں اور بااعتماد رفقاء کی ایک جماعت تشکیل دی، ان میں سرِ فہرست مولوی عبید اللہ سندھی تھے، جنہیں آپ نے افغانستان روانہ کیا اور وہ وہاں شمالی سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا اور قبائل) اور افغانستان میں موجود آپ کے تلامذہ واحباب اور آپ کے مابین رابطے کا ذریعہ بنے، پھر جب ان حضرات کو اپنے مقصد میں کچھ کامیابی حاصل ہوئی اور انہوں نے انقلاب کے لیے زمین ہموار کر دی اور دوسری طرف ہندوستان میں حضرت شیخ الہند کی کڑی نگرانی شروع ہو گئی تو آپ نے ۱۳۳۳ھ کو سوئے حجاز رختِ سفر باندھا، مکہ میں قیام پذیر ہوئے اور وہاں ترک گورنر غالب پاشا سے خفیہ ملاقات کی، پھر مدینہ منورہ کی طرف عازمِ

صور هذه الوثيقة، وقرر تسريبها إلى الهند وأفغانستان بطريقة سرية، واشتهرت فيها بعد بالرسائل الحريرية (ريشمي رومال-قاسمي) وصلت إلى الهند، وأراد الشيخ محمود حسن أن يصل إلى الحدود الشمالية الحرة بين أفغانستان والهند عن طريق إيران فسافر إلى الطائف، ورجع إلى مكة وأقام بها مدة، ودرس في صحيح البخاري وحج، وكان ذلك سنة أربع وثلاثين وثلاثمائة وألف.

واكتشفت الحكومة الإنجليزية المؤامرة، وعرفت قضية الرسائل الحريرية، فصرفت عنايتها إلى القبض على زعيم هذه الحركة وقطب رحاها (شيخ الهند محمود حسن-قاسمي)، وكان الشريف حسين أمير مكة قد خرج عن الدولة المتبوعة العثمانية، وثار عليها بتحريض الدولة الإنجليزية فأوعزت إلى الشريف بإلقاء القبض عليه وتسليمه إلى الحكومة الإنجليزية، فألقي القبض عليه في صفر سنة خمس وثلاثين وثلاثمائة وألف، ومعه المولوي حسين أحمد الفيض آبادي والحكيم نصرت حسين الكوروي والمولوي عزيز گل والمولوي وحيد أحمد، وسفر هؤلاء في الثامن عشر من ربيع الأول سنة خمس وثلاثين وثلاثمائة وألف إلى مصر ومنها إلى

سفر ہوئے اور وہاں وزیرِ جنگ انور پاشا اور چوتھے عثمانی لشکر کے عمومی کماندار جمال پاشا سے ملاقات کی اور ان سے ہندوستان کے مسلمانوں کی نصرت اور وہاں سے انگریز کو نکالنے کے لیے مدد فراہم کرنے کے بارے میں بات چیت کی۔ شیخ الہند ان حضرات سے ہندوستانی قوم کے نام ایک خفیہ پیغام لینے میں کامیاب ہو گئے جس میں انہوں نے ہندوستان کی آزادی کی حمایت کی تھی اور ہندوستانیوں کو حضرت شیخ الہند محمود حسن کی مدد کرنے اور ان پر اعتماد کرنے کا کہا تھا، اس دستاویز کی تصویریں لی گئیں اور انہیں خفیہ طور پر ہندوستان اور افغانستان پہنچانے کا فیصلہ کیا گیا، ہندوستان پہنچنے (اور راز افشاء ہونے) کے بعد یہ دستاویز ’ریشمی رومال‘ کے نام سے مشہور ہوئی (گو اس کا اصل نام غالب نامہ تھا)، شیخ الہند کا ارادہ تھا کہ ایران کے راستے افغانستان اور ہندوستان کے مابین شمالی سرحد کے آزاد علاقے تک پہنچ جائیں، سو آپ طائف گئے اور وہاں سے لوٹنے کے بعد کچھ عرصہ مکہ مکرمہ میں ٹھہر کر صحیح بخاری کا درس دیا اور حج کیا، یہ ۱۳۳۴ھ کا سال تھا۔

انگریز حکومت کو ریشمی رومال کے نام سے مشہور ہونے والی اس سازش کی سن گن مل گئی، اس نے اس سب کے اہم بنیادی قائد (حضرت شیخ الہند) کو گرفتار کرنے کی پوری کوشش کی، امیرِ مکہ شریف حسین کو، جو انگریز کے اُکسانے پر خلافتِ عثمانیہ کی اطاعت

ترک کر کے علمِ بغاوت بلند کر چکا تھا، انگریز نے شیخ الہند کو گرفتار کر کے اپنے حوالے کرنے کا کہا، چنانچہ صفر ۱۳۳۵ھ کو آپ کو گرفتار کر لیا گیا، آپ کے ساتھ مولوی حسین احمد فیض آبادی (مدنی) حکیم نصرت حسین کوروی، مولوی عزیز گل اور مولوی وحید احمد بھی تھے، ۱۸ ربیع الاول کو ان سب کو مصر روانہ کر دیا گیا اور وہاں سے ربیع الثانی کے آخر میں مالٹا پہنچے۔"

مالطه حيث وصلوا سلخ ربيع الآخر سنة خمس وثلاثين وثلاثمائة وألف.[۱۳]

نزہۃ الخواطر کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پہلے ہندوستانی مسلمانوں کے دل میں متسلط کفار کے خلاف جذبۂ جہاد بیدار کرنے کی کوشش کی پھر اس کو ایک خاص ترتیب میں لا کر اصل مقصد کو نبوی طریقہ اور ماثور طریقہ پر وجود میں لانے کے لیے مجاہدین کی تشکیل کی، افغانستان اور سرحدی علاقوں سے اپنے شاگردوں اور محبین کے ذریعہ یہ کام آگے بڑھانے کی کوشش کی، کفار کے خلاف انہوں نے ان دونوں محاذوں کو ایک حد تک تیار کرنے کے بعد بیرون ممالک کا سفر شروع کیا اور اس سلسلہ میں عالم اسلام کے زعماء اور قائدین سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی، خاص طور پر خلافت عثمانیہ ترکیہ جو اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اسلامی حکومت اور دار الاسلام تھی، اس کے ذمہ دار حضرات سے رابطہ کرنے کے لیے خاص طور پر کوشش کی اور ایک معتدبہ حد تک آپ اپنی کوششوں میں کامیاب بھی ہوئے، عثمانی خلافت کے بااثر ذمہ داراں سے آپ نے ملاقات کی، سارے حالات پیش کیے، اپنے منصوبے اور فکر و ترتیب کا خاکہ پیش کیا، دونوں طرف سے متحدہ طور پر کام کرنے کا فیصلہ ہوا، مسلمانوں کے اس عالمی مسئلے کو حل کرنے کے لیے اور اس فریضۂ منصبی کی ادائیگی کے لیے عالمی سطح پر اور عالمی محاذ پر کام شروع ہوا، جس کی تفصیل آپ کو سوانح شیخ الہند کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں ملے گی نیز مولانا حسین احمد مدنی کی کتاب نقش حیات میں بھی اس کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

---

[۱۳] نزهة الخواطر لعبد الحي الحسني المتوفى سنة ١٣٤١هـ، ص: ١٣٢٨، دار ابن حزم بيروت، الطبعة الأولى ١٤٢٠هـ-١٩٩٩ء

غدار اور منافقین ہر جگہ ہوتے ہیں

نزہۃ الخواطر کی عبارت سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ غداروں کی غداری کی وجہ سے یہ سارے منصوبے انگریز کے ہاتھ لگ گئے اور اس عالمی فکر کے روحِ رواں شیخ الہند کو گرفتار کرنے کے لیے انگریز نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ غداروں نے کفار کی پوری پوری مدد کی۔ امیر مکہ شریف حسین نے انگریز کے اشارے پر شیخ الہندؒ کو گرفتار کر کے انگریز کے حوالے کر دیا جنہوں نے انہیں طویل مدت تک جزائر مالٹا میں قید رکھا۔

بات مختصر کرنا چاہتا ہوں لیکن موضوع کچھ ایسا ہے کہ کچھ باتیں کیے بغیر حالات کی صورت واضح کرنا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ مالٹا میں شیخ الہند کے ساتھ دیگر علمائے کرام بھی اسارت کی زندگی گزار رہے تھے، ان علماء میں سر فہرست مولانا حسین احمد مدنی ہیں جو اپنے شیخ کے ساتھ مالٹا میں اسیر رہے۔

۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۰ء کے دوران مالٹا کی یہ اسارت قریباً تین سال پر مبنی تھی۔ یہ زمانہ شیخ الہند کی زندگی کا آخری مرحلہ تھا اور فیصلہ کن بھی جس میں آپ اپنی زندگی کی تمام تر کوششوں کو ایک نتیجہ کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ ایک عالمی ذمہ دار کی حیثیت سے اپنے ملک کے عام مسلمانوں کو کفار کے خلاف ابھار کر، اپنے شاگردوں اور متعلقین کو کفار کے خلاف جہاد کرنے کے لیے ایک خاص ترتیب میں لا کر اور دنیا کے دوسرے ممالک کے بااثر ذمہ داروں کو اس طرف متوجہ کر کے ایک عالمی منصوبے اور خاکے کو عملی جامہ پہنانے کے مرحلے میں جدوجہد کرتے کرتے قید ہو گئے، حالت قید میں بھی جہاں تک ممکن ہوا خود بھی اس فکر کے فروغ کے لیے کام کرتے رہے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے رہے۔

شیخ الہند کی فکر اور ان کی جدوجہد پر نظر ڈالیں تو نبوی طریقے کی جھلک اس میں دکھائی دے گی۔ اپنی سوچ و فکر میں پوری امت کی ذمہ داری وہ اپنے کاندھوں پر محسوس کرتے تھے اور اسی کے سبب سب کو ساتھ لے کر وہ چلے۔ ایسا شخص کبھی حالات کے ردوبدل سے متاثر نہیں ہوتا اور بڑی سے بڑی طاقت و قوت سے گھبراتا نہیں۔

قید سے رہائی کے چند ماہ بعد مختلف بیماریوں کے ہجوم کا مقابلہ کرتے کرتے آپ انتقال فرما گئے۔ آپ نے اپنے پیچھے اعلائے کلمۃ اللہ، اقامت خلافت اور دارالحرب کو پھر سے دارالاسلام میں تبدیل کرنے کی خاطر جہاد کا ایک قابل اتباع نمونہ چھوڑا۔ اللہ ان کے تمام مساعیٔ جمیلہ کو قبول فرمائے۔

تاریخ کے مذکورہ حصے سے ہمارا تعلق ہے

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کی تاریخ کا جو حصہ ہم بیان کر رہے تھے یہ اس تاریخ کا ایک مختصر حصہ ہے اور ہندوستان کے لاکھوں مربع میل رقبے میں سے محض ایک چھوٹے سے اس حصے کی کارگزاری ہے جس سے ہم وابستہ ہیں اور جس سے ہمارا دینی، علمی، اصلاحی اور دعوتی تعلق جڑتا ہے، اس کے علاوہ اور بھی سیکڑوں کارگزاریاں ہیں جو اس سلسلہ میں قابل ذکر ہیں مگر ہم صرف چند نمونے پیش کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے موضوع کی وضاحت میں معاون ثابت ہو سکیں۔

تاریخ کے اس حصے اور اس جیسے دیگر نمونوں سے درج ذیل باتیں وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہیں:

۱. مغلیہ سلطنت کے انعدام کلی اور انگریز کفار کے استحکام کلی کے بعد بھی دارالاسلام کے دوبارہ قیام اور اقامت خلافت اسلامیہ کے لیے ہندوستان کے چپے چپے میں مختلف کوششیں جاری تھیں۔
۲. شیخ الہند کی وفات، یعنی ۱۹۲۰ء تک ہندوستان دارالحرب ہی رہا اور اس کے دارالاسلام میں دوبارہ تبدیل ہونے کا کوئی مرحلہ رونما نہیں ہوا۔
۳. منافقین اپنے نفاق اور غداری میں سرگرم ہیں۔
۴. دارالعلوم دیوبند کے اولین فرزند اور اولین ترجمان کی حیثیت سے نیز بانیان دارالعلوم اور مجاہدین شاملی کے ایک لائق وارث ہونے کے ناتے شیخ الہند نے دنیا کے سامنے یہ واضح کر دیا کہ دارالعلوم دیوبند کی طرف نسبت رکھنے والوں کی ذمہ داری کیا ہے، ان کی سوچ اور فکر کس راہ پر، کس انداز سے چلے گی، ان کا طرز عمل کیا ہو گا۔

جمہوریت کی بدبو اور اس کا اثر

ہم اقرار کرتے ہیں کہ شیخ الہند کے بعد نبوی طریقے پر مسلح جہاد و قتال کے ذریعے اقامت خلافت کے ماثور طریق پر کام کرنے کی فکر و سوچ میں کچھ ضعف پیدا ہو گیا تھا۔ اس موقع پر قارئین کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب جمہوریت کی بدبو اسلامی دنیا میں پھیل رہی تھی اور ہندوستان بھی اس بدبو سے متاثر تھا۔ کفار کی ہزاروں بدبختیوں کے بیچ جمہوریت کی بدبختی کچھ خاص معلوم نہ ہوتی تھی لیکن مسلمانوں کے بیضاء نقیہ دین اور صاف شفاف شریعت میں یہ جمہوریت زہرِ قاتل بن کر آئی۔ کمال اتاترک جیسا ملحد، مرتد اور خبیث ترین دشمنِ اسلام منظر عام پر آگیا تھا اور اسلامی خلافت کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے جمہوریت کا نسخہ استعمال کرنے کی اس نے کوشش کی اور اپنے کافر حلیفوں کے ذریعے اپنے مقصد میں آگے بڑھا۔ اسلام نے جن جاہلی رسوم کو پیروں تلے روندا تھا اس خبیث نے ان سب کو جمہوریت کے سائے میں ابھارنے کی کوشش کی اور اسلام کے سارے شعار کو معدوم کرنے کے لیے ہر طور طریقہ اختیار کیا۔ بہر حال یہ داستان بہت لمبی ہے اور ہم اس میں الجھنا نہیں چاہتے، محض دنیا کے اس وقت کے حالات کی ایک تصویر قارئین کے سامنے پیش کرنا مقصود تھی تاکہ دیگر باتیں سمجھنے میں آسانی ہو۔

ایک الم ناک حقیقت

اس زمانہ میں ایک اور الم ناک حقیقت سامنے آئی جس کو مانے بغیر کوئی چارہ نہیں، وہ یہ ہے کہ شیخ الہند کے آخری زمانہ تک سیاست، قیادت، شریعت اسلامی کا نفاذ، خلافت و امارت اسلامیہ کی اقامت جیسے تمام امور کی ادائیگی ایک شرعی ذمہ داری کی حیثیت سے علمائے کرام اور دین و شریعت کے رہبران سو فیصد اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے تھے، ہر معاملے کو صرف اور صرف قرآن و سنت کی رو سے دیکھتے، شریعت کی نظر سے پرکھتے اور شرعی لحاظ سے جو درست معلوم ہوتا اسے نافذ کرتے اور دیگر کو چھوڑ دیتے۔ اصل منبع صرف شریعت ہی تھی۔ اسی کے سائے میں تمام معاملات طے ہوا کرتے تھے۔ شریعت کی قائم کی ہوئی حدود سے تجاوز نہ کیا جاتا اور شرعی حدود کو ہی اپنے لیے حدود تصور کیا جاتا۔

لیکن اس کے بعد حالت کچھ ایسی ہوگئی کہ گو علمائے کرام اور رہبران دین حق گوئی، جاں نثاری، قربانی، جذبۂ جہاد، شریعت کی پابندی غرض ہر باب میں اپنی شرعی ذمہ داری کا حق ادا کرتے رہے لیکن رفتہ رفتہ قیادت وسیادت ان کے ہاتھوں سے نکلتی چلی گئی۔

مشائخ اسلام اور سیاسی لیڈر

لیڈر شپ جن کے ہاتھ میں تھی وہ اپنے آپ کو ایک مسلم قائد کے بجائے ایک کامیاب لیڈر سمجھنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ ان لیڈروں میں سے جو مسلمان تھے وہ دین وشریعت کا احترام کرتے تھے، اپنے دین سے محبت کرتے تھے اور اس پر عمل پیرا تھے، اسلام کے حق میں ان کی بے شمار خدمات اور بہت سے کارنامے ہیں۔ مگر وہ ہر معاملے میں شریعتِ اسلامی کو حاکم ماننے پر تیار نہ تھے۔ وہ اجتماعی اور سیاسی اور بین الاقوامی معاملات کو قرآن وسنت کی روسے حل کرنے پر آمادہ نہیں تھے، ان کی گفتگو اور سوچ وفکر میں قرآن وحدیث اور دین وشریعت کا اثر نظر نہیں آتا تھا۔ وہ علمائے کرام اور مسلمانوں کے دینی رہبروں کے جذبات کو اپنی سوچ وفکر اور اس نصب العین کی طرف راغب کرکے جس پر ایک دنیاوی لیڈر ہونے کی حیثیت سے وہ کاربند تھے، اسی نتیجے پر پہنچانا چاہتے تھے جو اس قسم کی دنیاوی جدوجہد سے سامنے آسکتا ہے۔ اس سارے عمل کے دوران دین وشریعت کا کچھ باقی رہے یا نہ رہے، اس سے ان کو چنداں سروکار نہ تھا۔

بہرحال اس موقع پر دو باتیں عرض کررہا تھا:

- ایک یہ کہ شیخ الہند کے بعد کفار کے خلاف جہاد کا مسئلہ کچھ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا جو سیاسی لیڈر تو تھے مگر مسلمانوں کے قائد نہیں تھے۔ وہ انگریز سے ہندوستان آزاد کرانا چاہتے تھے لیکن کفار سے مسلمانوں کی آزادی نہیں چاہتے تھے۔ وہ کفار کا تسلط ختم کرنا چاہتے تھے لیکن قرآن اور سنت کے احکام کا اجرا نہیں چاہتے تھے۔ وہ برٹش سامراج نہیں چاہتے تھے لیکن وہ خلافت اسلامیہ بھی نہیں چاہتے

تھے۔ وہ انگریز کی حکومت سے ہندوستان کو نکالنا چاہتے تھے لیکن اس ہندوستان کو دارالاسلام بنانا نہیں چاہتے تھے، یہ پہلی بات ہے۔

- دوسری بات جو میں کہہ رہا تھا وہ یہ ہے کہ اس صورت حال میں علمائے کرام اور رہبران امت کچھ بے بس ہوگئے تھے، کچھ تمنائے خیر میں بے قابو تھے اور کسی بھی طرح مسلمانوں کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے، کچھ لیڈروں کی زبان دانی سے دھوکہ کھا گئے، کچھ اپنے حقوق ادا کرنے کے بارے میں خود پر مضبوط اعتماد رکھتے تھے تو کسی کو ان لیڈروں کو قیادت سونپنے کے سوا کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ خلافت وسیادت و قیادت کے باب میں علمائے کرام پر ایک قسم کی اکتاہٹ رفتہ رفتہ چھارہی تھی۔ سیاست و امارت کے امور میں ان کی دلچسپی تنزل کی طرف جارہی تھی، شیخ الہندؒ کے بعد سے لے کر تنزل کی یہ صورت حال تین مراحل میں تکمیل تک پہنچی۔ پہلا مرحلہ: استحقاق سے حق کی ادائیگی، جس پر آزادئ ہند تک کوششیں جاری تھیں، دوسرا مرحلہ: منت سماجت سے حق کی ادائیگی اور یہ کوششیں آزادئ ہند کے بعد بھی سالہا سال تک چلتی رہیں، تیسرا مرحلہ: علیحدگی پر رضا اور راحت کا تصور بلکہ خلافت، امارت، سیادت اور سیاست کے بارے میں نفرت۔ بدنصیبی سے اس صورت حال کا سامنا ہم اب تک کر رہے ہیں۔

خلاصہ

خلاصے کے طور پر میں چند حقیقتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں:

- لیڈروں کے اپنے افعال و اقوال اس بارے میں بالکل واضح تھے کہ وہ آزادئ ہند کی جدوجہد سے ایک دارالحرب کو دارالاسلام بنانے کی کوئی کوشش نہیں کر رہے۔
- آزادئ ہند کی اصل باگ ڈور اور قیادت وسیادت علماء کے ہاتھ سے نکل کر لیڈروں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ نتیجتاً برطانوی راج کے ساتھ تمام معاملات لیڈروں ہی نے طے کیے۔
- لیڈر ہندوستان کو سرکارِ برطانیہ سے آزادی کے بعد اسلام کی بجائے جمہوریت کی جانب لے گئے۔

- ہندوستان میں برطانوی راج کے دور میں رائج قوانین کو تبدیل کرنے کی لیڈروں نے کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ایک اور حقیقت کا انکشاف

ایک اور حقیقت کی طرف میں آپ حضرات کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ ۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے دن کو بالترتیب پاکستان اور بھارت کے یوم آزادی کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے جو بالکل غلط ہے۔ اس روز نہ پاکستان آزاد ہوا تھا اور نہ ہی بھارت...... اس روز تو محض ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہوا تھا۔ ایک ٹکڑے کو مملکت بھارت کا نام دیا گیا اور دوسرے کو مملکت پاکستان۔

ایک ٹکڑے کی تفصیل یہ ہے:

- سرکاری دستور: بادشاہت
- بادشاہ: ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک جارج ششم
- گورنر جنرل: ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء تک لارڈ ماؤنٹ بیٹن
- وزیر اعظم: ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک جواہر لعل نہرو

اور دوسرے ٹکڑے کی تفصیل کچھ یوں ہے:

- سرکاری دستور: بادشاہت
- بادشاہ: ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۲ء تک جارج ششم اور ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۶ء تک ملکہ الزبتھ ثانی
- گورنر جنرل: محمد علی جناح

یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جو عوام کی نگاہوں سے اوجھل ہیں مگر انہیں تاریخ کے صفحات سے محو کرنا ممکن نہیں۔ ہم بلا تردد کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء میں اس برِّ صغیر میں بہت سی تبدیلیاں آئیں لیکن ایک تبدیلی جو نہیں آئی وہ ہندوستان

کے دارالحرب سے دارالاسلام میں تبدیلی تھی۔ چنانچہ دونوں ٹکڑوں میں سے کسی ایک کا بھی عنوان دارالاسلام نہیں تھا، لہٰذا دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کا کوئی مسئلہ سرے سے زیر بحث تھا ہی نہیں۔ تقسیم کے فیصلے میں ہجرت کے وجوب یا حرمت کا کوئی مسئلہ زیر بحث نہ تھا، دونوں ٹکڑوں کے کروڑوں مسلمانوں کے بارے میں شریعت کا کیا فیصلہ ہے...... اس کی تحقیق و تفتیش کہیں موضوع بحث تھی ہی نہیں اور نہ اس کی مجال ہو سکتی تھی۔ بعض لوگوں کو مہاجر کے نام سے موسوم کیا گیا مگر وہاں انصار کون تھا؟ ہجرت کے احکام و مسائل کا نفاذ نہ سرحد کے اِس پار تھا نہ اُس پار۔

مکرر، آخری بات یہ کہ ۱۹۴۷ء، جس کو ہندوستان کی آزادی کا سال سمجھا جاتا ہے، اس سے بھارت اور پاکستان تو وجود میں آئے مگر ہندوستان دارالحرب سے دارالاسلام نہ بن سکا۔

آزادئ ہند اور قیام پاکستان سے لے کر تقسیم پاکستان اور قیام بنگلہ دیش تک (۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۱ء)

جس طرح ہم نے ذکر کیا کہ برطانوی راج نے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کو دو ٹکڑوں میں بانٹ تو دیا مگر وہ بدستور دونوں ٹکڑوں پر حکومت کرتا رہا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کے مقامی نمائندے اس کی منشا کے مطابق کام کریں گے تو اس نے اپنے نمائندوں کو اکثر امور میں بااختیار بنا دیا۔ نوزائیدہ دونوں ممالک کے حالات کی تصویر کچھ اس طرح سے تھی:

- عدالتوں میں اسی آئین و قانون کی پاسداری ہو رہی تھی جس کے مطابق ۱۹۴۷ء سے پہلے تک برطانوی راج ہندوستان کو چلا رہا تھا۔
- دونوں مملکتوں میں مشائخ اسلام اور رہبران امت کو حکومت کے بااثر عہدوں سے بہت دور رکھا گیا۔
- دونوں ٹکڑوں میں جمہوریت مضبوطی سے اپنے اصولوں پر قائم تھی۔
- دونوں ریاستوں میں سیکولرازم یا علمانی نظریہ اپنے اصول و عقائد پر جما دکھائی دیتا ہے۔

- تقسیم سے قبل مسلمان جتنا اپنے دین پر عمل کر سکتا تھا، جس قدر اسے اپنے دائرۂ کار میں نافذ کر سکتا تھا، بعد از تقسیم کسی بھی مملکت میں اتنا بھی ممکن نہ رہا۔
- دونوں حصوں میں کسی قانون اور آئین کی کسی شق میں تبدیلی یا اضافے کے وقت قرآن و سنت سے رجوع کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی۔
- سرحد کے دونوں طرف قانون ساز اسمبلی میں قرآن وحدیث یا فقہ اسلامی کا حوالہ پیش کرنے کو ایک لغو اور مضحکہ خیز امر سمجھا جاتا تھا۔
- دونوں طرف مسلمان عوام پر نافذ ہونے والا قانون کوئی بھی بنا سکتا ہے، خواہ وہ ہندو ہو سکھ ہو، بدھ ہو یا عیسائی یا یہودی۔
- کسی بھی دھرم کا پیروکار مسلمانوں کا قاضی اور حاکم ہو سکتا ہے، وہ کوئی بھی قانون ان پر نافذ کر سکتا ہے، اِس ٹکڑے میں بھی اور اُس ٹکڑے میں بھی۔
- اسلامی خلافت، اسلامی امارت اور شریعت کے نفاذ کے لیے ہتھیار اٹھانا ناقابل معافی جرم ہے، اِس طرف بھی اور اُس طرف بھی۔

مندرجہ بالا عنوانات کی شرح بہت مفصل ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ قریباً گزشتہ ایک صدی میں رونما ہونے والے حالات ان عنوانات کی شرح ہیں، جنہیں ہمارے آباؤ اجداد نے دیکھا اور اب ہم بچشم عبرت ان کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

بھارتی مسلمانوں نے اہل کتاب حکمرانوں سے آزادی حاصل کی تو مشرک حکمران ان پر مسلط ہو گئے۔ بھارتی حکومت سو فیصد حکم بغیر ما أنزل اللہ پر قائم ہے۔ سیاسی مصالح کے پیش نظر مسلمانوں کو جب اور جتنا دینا چاہتے ہیں دے دیتے ہیں، کبھی پارلیمنٹ کی کوئی کرسی، کبھی کوئی حکومتی عہدہ، کبھی کسی مجلس کی صدارت تو کبھی مساجد و مدارس کو ہدیتاً کچھ عطا کرنا اور کبھی کسی خاص ملکی کارنامے پر شاباشی کے نعروں سے استقبال کرنا وغیرہ وغیرہ۔

دوسری طرف پاکستان کے حکمران مسلمانیت کا دعویٰ کرتے ہیں مگر خود کو شیعہ کہلانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ سب جمہوری اور علمانی ہیں، اسلامی شریعت کے نفاذ کو روا نہیں سمجھتے، انسان کے بنائے قانون کے مطابق مملکت چلانے کو ہی اصل اور صحیح طریقہ سمجھتے ہیں، غیر شرعی قانون پر ملک چلانے کو ضروری سمجھتے ہیں، مسلم اکثریت پر غیر شرعی حکومت اور کفری نظام چلانے کے لیے جو جو کرنا چاہیے وہ کرتے ہیں، مسلمانوں پر کفری نظام کے نفاذ میں جہاں جہاں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے وہاں کچھ نفاق کچھ جھوٹ سے کام چلا لیتے ہیں۔ پاکستان اسی طرح چل رہا تھا اور یوں ہی بائیس تیئیس سال گزر گئے، اس کے بعد حصولِ اقتدار کی خاطر مالکان حکومت کے مابین مشرق و مغرب کا جھگڑا ہو گیا، پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا اور بنگلہ دیش کے نام سے ایک نیا ملک وجود میں آ گیا۔

تقسیم پاکستان اور قیام بنگلہ دیش سے لے کر اب تک (۱۹۷۱ء تا حال)

بنگلہ دیش جن کے ہاتھوں وجود میں آیا انہوں نے منافقت کا قلادہ اتار پھینکا اور صریح کفر کا اعلان کر دیا۔ چار متفق علیہ کفریہ اصولوں پر دستور کی بنیاد رکھی گئی۔ مسلمانوں کے لیے الگ ملک ہونے کے جس تصور کی بنا پر پاکستان وجود میں آیا، اس تصور ہی کو مٹا دیا گیا اور آئین میں جہاں جہاں اسلام اور مسلمان کا ذکر ہے وہاں سے یہ الفاظ ہٹا کر بنگالی اور بنگلہ دیشی جیسے الفاظ استعمال کیے گئے۔

ملک کا دستور بدستور وہی ہے جو برطانوی راج کے دور میں تھا اور جو متحدہ پاکستان میں تھا۔ ملک کے کسی بھی عہدے کے لیے اسلام یا مسلمان ہونا کوئی شرط نہیں۔ قانون ساز اسمبلی، ہر درجے کے قاضی، صدر مملکت...... غرض ہر عہدے میں مسلم اور غیر مسلم کے بیچ کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا۔ یہی حال برطانوی ہندوستان، بھارت، پاکستان اور آج کے بنگلہ دیش میں ہر دور میں رہا ہے۔ برطانوی ہندوستان سے آج بنگلہ دیش کے قیام کے پچاس برس گزر جانے کے بعد بھی برِّصغیر میں جن باتوں میں کوئی فرق نہیں آیا وہ یہ ہیں:

- ہر دور میں ملک کا دستور غیر اسلامی تھا اور اب تک غیر اسلامی ہی ہے۔

- حکومت اور اقتدار مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ مسلم اور غیر مسلم ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اقتدار کی کرسی پر بیٹھے اور سب پر حکومت کرے۔ قانونی طور پر یہ سب کا حق ہے۔
- از روئے دستور قانون سازی میں قرآن، حدیث یعنی شریعت اسلامیہ کا کوئی عمل دخل نہیں اور نہ ہی قرآن وحدیث میں بیان کردہ اصولوں کی بنیاد پر احتجاج کا حق ہے۔ احتجاج کے حق سے جسے موسوم کیا جاتا ہے وہ کفری دستور کے فیصلے پر موقوف ہے۔ شریعہ بینچ کی بنیاد بہت بعد میں بعض مصلحتوں کی بنا پر پڑی مگر اس کا کوئی فائدہ مسلمانوں کو حاصل نہیں ہوا۔
- قانون ساز اسمبلی کے اراکین ہر دھرم سے تعلق رکھتے ہیں یوں ہر مذہب کا پیروکار مسلمانوں کے لیے قوانین وضع کر سکتا ہے اور ان کو ماننا اس ملک کے مسلمانوں کے لیے لازم بھی ہے۔
- شریعت اسلامی کے صریح اور قطعی احکامات کے خلاف بے شمار قوانین اور فیصلے موجود ہیں، اور جو شریعت کے خلاف نہیں ہیں وہ بھی قرآن وسنت کی موافقت کی وجہ سے نہیں بلکہ اتفاقاً ایسے ہیں۔
- ان خلاف شرع قوانین کی پابندی کرنے اور ان کے خلاف نہ کرنے کا عہد ضروری ہے۔
- شرعی فرائض وواجبات کی تعلیم، تبلیغ اور تحریض کی اجازت نہیں بلکہ ہر شعبۂ ایمان کی تعلیم، تبلیغ اور تحریض ناقابل معافی جرم ہے۔
- زنا، شراب، سود، سن بلوغ کے بعد بھی شادی کرنے کی ممانعت۔ کفار اور ائمۃ الکفر کے ساتھ موالات، جہاد کی بالفعل مخالفت اور مجاہدین پر ہر قسم کا سب وشتم روا رکھنا۔ اقامت خلافت اور امارت اسلامیہ کے قیام کو روکنے کے لیے ہر قسم کی سرگرمیاں۔ کفار کے خلاف لڑنے کو خلاف انسانیت قرار دینا، اسلام اور غیر اسلام کی بنا پر قتال کرنے کو ناجائز قرار دینا اور اس تصور کو ناقابل عفو جرم شمار کرنا۔ دارالاسلام اور دارالحرب کے عنوان پر دنیا کی تقسیم کو عصبیت، بنیاد پرستی، متخلف مزاج اور دہشت گردی سے موسوم کرنا۔ نفاذِ شریعت کے لیے کوشش کرنے والوں کے خلاف لڑائی کرنے والے کفار کا ساتھ دینا۔ علم دین سیکھنے کو وجوبی حیثیت نہ دینا۔ مسلمانوں کو ارتکاب معاصی پر مجبور کرنے کے لیے وجوبی قانون بنانا اور اس کو نافذ کرنا۔ غیر مسلموں کو اپنے عقائد شرک اور کفر کی اشاعت، تبلیغ اور تعلیم کی اجازت دینا، اس کا

سرکاری سطح پر انتظام کرنا اور اس کی حوصلہ افزائی، اعانت اور ان کی تقریبات میں شرکت کرنا۔ شرائع اسلام پر عمل کرنے کے لیے غیر اسلامی دستور کی موافقت کو برقرار رکھنا اور ان کے لیے غیر اسلامی دستور کے ذمہ داروں سے اجازت لیناضروری ہونا......وغیرہ لاتعداد و بے شمار امور ہیں۔

ان باتوں پر غور کرنے سے آپ کو معلوم ہو گا کہ شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے جن حالات اور جن باتوں کے پیش نظر اس ملک برِّصغیر کو دارالحرب قرار دیا تھا وہ حالات بعینہٖ اب بھی بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش میں موجود ہیں۔

تقسیم کے بعد یہ تینوں ممالک اپنی اپنی جگہ اپنے اقدامات اور طرزِ حکومت کے ذریعے امت کو یہ پیغام دیتے رہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے نام پر ان ممالک پر حکمرانی کرنا ایک ناقابل معافی جرم ہے، وہ یہ پیغام دیتے رہے کہ قانون ساز اسمبلی کے ذریعے قرآن و حدیث میں بیان کردہ کسی اصول کو قانون کا درجہ دینا یا قرآن و حدیث کی بنا پر کسی موجود قانون کو معطل کرنا ایک ناقابل معافی جرم ہے، ان تینوں ممالک کی عدالتوں میں قرآن و حدیث کی بنیاد پر کسی قانون کے خلاف احتجاج کرنے کو جہالت اور بے وقوفی کے مترادف سمجھا جاتا ہے......اور بالفعل یہی حقیقت ہے۔

پاکستان کے شریعہ بینچ سے کوئی دھوکہ نہ کھائے

ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ پاکستان میں شریعہ بینچ کے عنوان سے جو بینچ ہے اس کا سالہا سال تک کوئی وجود ہی نہ تھا اور جب یہ قائم ہوا تو یہ بینچ کل عدالتی کارروائیوں کے ایک فی صد پر بھی حاوی نہ تھا۔ نیز کسی ملک میں شریعہ بینچ کا وجود ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس ملک کا قانون کفری اور غیر شرعی ہے۔ اس 'قوت و اختیار' کے ساتھ پاکستان کا یہ شریعہ بینچ کبھی ملکی قوانین کے خلاف کوئی فیصلہ نافذ نہیں کرا سکا۔ متفق علیہ سود کے مسئلے پر پاکستان کے کبار علماء نے اپنی زندگی کھپا دی مگر سب جدوجہد بے سود نکلی۔

تاریخ کے چند صفحات پر نظر ڈالنے کے بعد

اس موقع پر میں قارئین کرام کی توجہ قرآن مجید کی دو آیتوں کی جانب مبذول کروانا چاہتا ہوں کہ یہی ہمارے لیے تسلی اور اطمینان کا باعث ہیں۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ○(سورۃ البقرۃ:۱۳۴)

''یہ جماعت تو گزر چکی، جو انہوں نے کہا وہ ان کے لیے ہے اور جو تم کروگے تمہارے لیے ہے۔ ان کے اعمال کے بارے میں تم سے نہیں پوچھا جائے گا۔''

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُونِ الْأُولَىٰ ○ قَالَ عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي فِي كِتَابٍ لَّا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى○(سورۃ طہٰ:۵۱،۵۲)

''اس نے کہا: اچھا یہ تو بتاؤ اگلے زمانے والوں کا حال کیا ہونا ہے؟ جواب دیا کہ ان کا علم میرے رب کے ہاں کتاب میں موجود ہے، نہ تو میرا رب غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے۔''

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خیر القرون کے بعد سلف صالحین کے جتنے طبقے ہیں وہ سب کے سب ہمارے لیے مقتدا اور رہنما ضرور ہیں لیکن ادلّہ اربعہ کے خلاف وہ ہمارے لیے حجت نہیں۔ ان کے کسی خاص رویے کے بارے میں قطعی کوئی فیصلہ کرنا بھی ہماری ذمہ داری نہیں اور ادلّہ شرعیہ کے خلاف ان کو حجت ماننا بھی ہمارے لیے جائز نہیں۔ کسی بھی شرعی مسئلے میں اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کرنے کے لیے ہمارے سامنے قرآن مجید ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تئیس سالہ نبوی زندگی ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شرعی تمرین و تطبیق کا سو سالہ تجربہ ہے۔

ہماری کمزوری

اس موقع پر ایک بات یاد آگئی جس کو کہے بغیر گزر جانا مناسب معلوم نہیں ہوتا اور وہ یہ کہ مکہ کے بت پرست مشرکین سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کو اپنا مقتدا سمجھتے تھے، خود کو ابنائے ابراہیم اور ملت ابراہیم ماننے میں فخر محسوس

کرتے تھے، یہودی حضرت ابراہیمؑ کو یہودی سمجھتے تھے اور نصاریٰ نصرانی سمجھتے تھے، لیکن اللہ رب العزت نے واضح طور پر فرما دیا:

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِن كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ○ إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ○(سورۃ آل عمران:٦٨،٦٧)

”(تمہیں بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ) ابراہیم (علیہ السلام) نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ وہ تو بالکل یکسو ہو کر اللہ کے فرماں بردار تھے اور نہ وہ مشرکوں میں سے تھے۔ یقیناً ابراہیم (علیہ السلام) سے سب سے زیادہ قربت رکھنے والے لوگ تو وہ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی اور اب یہ نبی (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور جو ان پر ایمان لائے (اس نسبت کے زیادہ حق دار ہیں) اور اللہ ان مومنوں کا ساتھی ہے۔“

مطلب یہ کہ متفق علیہ شخصیات کو اپنا مقتدا ثابت کرنے میں ہر شخص دلچسپی رکھتا ہے لیکن ان کی اتباع کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ہمارے اسلاف کو بھی بارہا اسی صورت حال کا سامنا رہا ہے۔ کوئی اپنے آپ کو ولی اللّٰہی فکر کا حامل قرار دیتا ہے، لیکن شاہ ولی اللہ کے تجدیدی کارناموں کو اپنانے پر تیار نہیں، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے نام سے دل میں فخر محسوس کرتا ہے اور ان کا فتویٰ دل کو بھاتا ہے مگر اس فتوے کو قبول کر کے اس کے مطابق عمل کرنے سے دل بھاگتا ہے، سیّد احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید رحمہا اللہ کے جذبۂ جہاد سے متفق نظر آتا ہے لیکن جہاد کے نام پر ناک بھوں چڑھانے لگتا ہے، مکی، گنگوہی، نانوتوی کے ناموں سے دل و دماغ اور روح و بدن میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے لیکن دشمنوں کی سرکوبی کے لیے اپنی جان و مال کی قربانی دینے کو روا نہیں سمجھتا، شیخ الہند کے نام سے سینہ فخر و غرور سے تن جاتا ہے لیکن علمائے کرام کے لیے اقامت خلافت کی فکر اور اس کے لیے عملی کوششوں میں شرکت کو ناجائز سمجھتا ہے...... بہر حال یہ سب ہماری کمزوریاں ہیں جن کی داستان بہت لمبی ہے۔ لیکن کوئی کچھ بھی کہے ہمارے لیے قابلِ عمل راستہ صرف ایک ہے اور وہ ہے اللہ رب العزت کی نازل کردہ شریعت، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ (صلی اللہ

علیہ وسلم) کاراستہ، لہٰذا تاریخ کی اس مختصر داستان کے بعد ہم ان ذمہ داریوں کے بارے میں بات کریں گے جو قرآن وحدیث کی روسے ہم پر عائد ہوتی ہیں، اللہ درست بات کی توفیق عطافرمائیں، آمین۔

برِّ صغیر جب مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر غیر مسلموں کے قبضے میں چلا گیا اور مسلمان ایک دارالحرب میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے تو وقت کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے علماء نے اپنی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے دو کام کیے: ایک تو مسئلے کی شرعی حیثیت واضح کی اور ببانگ دہل بتایا کہ اب ہندوستان کی حیثیت دارالحرب کی ہے اور پھر یہ واضح کیا کہ دارالحرب میں بسنے والے مسلمانوں کی کیا ذمہ داری ہے۔ دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ دارالحرب کو دوبارہ دارالاسلام میں تبدیل کرنے کے لیے عملی جہاد کا آغاز کیا اور اس کے لیے جو تیاری مطلوب تھی اس میں مصروف ہو گئے۔

اس موقع پر میں مقدمہ کے طور پر کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں جن کے بارے میں امید رکھتا ہوں کہ کسی کو ان سے اختلاف نہیں ہو گا اور امید کرتا ہوں کہ ان باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا ہمارے لیے آسان ہو گا۔ وہ باتیں یہ ہیں:

١. ذمہ داری کی ادائیگی میں تاخیر اور تکاسل کی وجہ سے ذمہ داری میں تخفیف نہیں ہوتی۔
٢. ایک نسل اگر خود پر عائد شدہ ذمہ داری ادا نہ کر سکے تو آنے والی نسلوں سے وہ ذمہ داری ساقط نہیں ہوتی۔
٣. ان ممالک میں کفری نظام قائم رکھنے والی قوت ان ممالک کے حکمران ہیں، دوسرے عناصر ان کے معاونین ہیں۔
٤. اقامت دین و شریعت، اقامت خلافت اور امارت اسلامیہ کا قیام مسلمانوں پر عائد فرض ہے اور اس فرض کی ادائیگی میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا بھی فرض ہے۔
٥. حالات کے عذر سے فرض کی ادائیگی کی کیفیت تو بدل سکتی ہے لیکن حکم معطل نہیں ہو سکتا۔
٦. فرض جہاد کی ذمہ داری جہاد کی تیاری اور عملی جہاد کے ذریعے ہی ادا ہو سکتی ہے، دوسرے فرائض کی ادائیگی اس کا متبادل نہیں ہو سکتی، مثلاً نماز، روزہ اور حج کی ادائیگی جہاد کا بدل نہیں ہو سکتی۔

۷۔ جہاد کی تیاری انہی امور کو کہا جائے گا جنہیں قرآن وحدیث نے جہاد کی تیاری کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔

یہ چند باتیں عرض کرنے کے بعد ہم دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ فی الحال برِّصغیر، یعنی بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں پر اس باب میں کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

مندرجہ بالا عنوانات پر بات شروع کرنے سے پہلے ہم یہ طے کرلیں کہ ہم ہر بات کو شریعت کی رو سے پرکھنے کی کوشش کریں گے اور اس کے لیے اللہ پاک سے توفیق بھی مانگتے ہیں۔ تاریخ سے ہم عبرت حاصل کریں گے، رہنمائی لیں گے، راستے تلاش کرنے کا اسلوب سیکھیں گے، دشمن کا مقابلہ کرکے جیتنے کا گر سیکھیں گے، منافقین، ملحدین، زنادقہ کے مکائد اور مکاریوں سے اپنے آپ اور اپنی امت کو بچانا سیکھیں گے مگر فیصلہ ہم قرآن وحدیث یعنی ادلّۂ شرعیہ اور ائمۂ مجتہدین سے ہی لیں گے، ان شاء اللہ۔ اللہ توفیق عطا فرمائیں۔

ہماری ذمہ داری کیا ہے؟

ہماری اولین ذمہ داری آج وہی ہے جو اُس وقت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ اور اُس زمانے کے دیگر ائمہ نے ادا کی تھی یعنی اُن ممالک کی شرعی حیثیت سب کے سامنے دلائل کی رو سے واضح کرنا۔ اسی طرح سیّد احمد بریلویؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ نے جو ذمہ داری ادا کی تھی وہی آج ہم مسلمانوں پر عائد ہے، یعنی جتنا کچھ میسر ہے اس کو دشمن سے مقابلے کے لیے میدانِ جہاد میں اترنے کی خاطر مرتب کرنا، عملی جہاد کے لیے بالفعل فکر شروع کرنا اور ایک کامیاب جہاد کے لیے جو جو تیاریاں ہونی چاہییں وہ سب کرنا۔ اب ہم اس سب کی کچھ تفصیل بیان کرتے ہیں۔

پہلی ذمہ داری: عدو صائل اور ان کے نائبین سے مغصوبہ دارالاسلام آزاد کرانا

تاریخ کے مختصر مطالعے سے ہمارے سامنے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ برِّصغیر جب ایک مرتبہ دارالحرب کی حیثیت اختیار کر گیا تو دوبارہ دارالاسلام بننا اسے نصیب نہ ہوا۔ جن حالات و خلفیات کے تحت اس خطۂ زمین کو دارالحرب قرار دیا گیا تھا بعینہٖ وہی حالات آج بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش میں بھی درپیش ہیں۔

لہٰذا دارالاسلام کے حصول کی کوشش مسلمانوں پر فرض ہے اور اس سلسلے میں جو رکاوٹیں بھی درپیش ہوں ان کو دور کرنے کے لیے جہاد بھی مسلمانوں پر فرض ہے اور چونکہ یہ جہاد اپنے خطۂ زمین کو واپس لینے کا جہاد ہے لہٰذا یہ فرض عین دفاعی جہاد ہے۔

اس بارے میں دلائل ملاحظہ کرنے سے پہلے مقدمے کے طور پر جو چند باتیں عرض کی تھیں ان کو دوبارہ یاد کریں اور غور کریں۔

مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

(فإن هجم) أي: غلب (العدو) أي: على بلد من بلاد الإسلام، أو ناحية من نواحيها. وفي المغرب الهجوم الإتيان بغتة، والدخول من

"(اگر حملہ کرے) یعنی غالب ہو جائے (دشمن) یعنی دارالاسلام کے کسی شہر پر یا دارالاسلام کے کسی خطے پر:

غير استئذان (ففرض عين فتخرج المرأة، والعبد بلا إذن الزوج، والمولى) ؛ لأن المقصود لا يحصل إلا بإقامة الكل فيفرض على الكل وحق الزوج، والمولى لا يظهر في حق فروض الأعيان، وكذا يخرج الولد بغير إذن والديه، والغريم بغير إذن دائنه وإن الزوج، والمولى إذا منعا أثما.

وفي البحر امرأة مسلمة سبيت بالمشرق وجب على أهل المغرب تخليصها ما لم تدخل حصونهم وحرزهم قال في الذخيرة إذا جاء النفير إنما يصير فرض عين على من يقرب من العدو وهم يقدرون على الجهاد فأما من وراءهم يبعد من العدو، فإن كان الذين هم بقرب العدو عاجزين عن مقاومة العدو القادرين إلا أنهم لا يجاهدون لكسل بهم، أو تهاون افترض على من يليهم فرض عين، ثم من يليهم كذلك حتى يفترض على هذا التدريج على المسلمين كلهم شرقا وغربا انتهى.[14]

اور مغرب میں ہے: ہجوم کا معنی ہے اچانک آجانا اور اجازت مانگے بغیر داخل ہو جانا (تو فرض عین ہے، پس عورت اور غلام اپنے شوہر اور مولا کی اجازت کے بغیر نکل جائے) کیونکہ سب کی شرکت کے بغیر مقصد ادا نہیں ہو گا لہٰذا سب پر فرض ہو جائے گا اور شوہر اور مولا کا حق فرضِ عین امور میں ظاہر نہ ہو گا۔ اسی طرح لڑکا اپنے باپ کی اجازت کے بغیر اور قرض لینے والا قرض دینے والے کی اجازت کے بغیر نکل جائے گا اور شوہر اور مولا اگر منع کریں تو گناہ گار ہوں گے۔

بحر میں ہے کہ اگر کوئی مسلمہ عورت مشرقی علاقوں میں دشمن کے ہاتھوں اسیر ہو جائے تو مغرب کے مسلمانوں پر اس کو چھڑوانا واجب ہے، جب تک کہ وہ ان کے قلعہ اور ان کی حفاظت کی حدود میں داخل نہ ہو جائے۔ ذخیرہ میں ہے کہ جب نفیر عام ہو گی تب فرض عین ہو جائے گا ان پر جو دشمن سے قریب ہیں، جبکہ وہ جہاد کی طاقت رکھتے ہوں، اور جو دشمن سے دور ہیں ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ دشمن کے قریب والے مسلمان اگر دشمن کے مقابلے سے عاجز ہوں یا وہ مقابلہ کرنے کی قوت تو رکھتے ہوں لیکن سستی یا غفلت کی وجہ سے جہاد نہ کریں، تو پھر ان سے قریب والے مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جائے گا اور اس کے

[14] مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر، أحكام الجهاد

بعد جو ان سے قریب ہیں ان پر...... اور اس طرح مشرق و مغرب میں بسنے والے سب مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جائے گا۔"

عنایہ شرح ہدایہ کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

"ثم الجهاد يصير فرض عين عند النفير العام على من يقرب من العدو وهو يقدر عليه، وأما من وراءهم فلا يكون فرضا عليهم إلا إذا احتيج إليهم، إما لعجز القريب عن المقاومة مع العدو، وإما للتكاسل فحينئذ يفرض على من يليهم ثم وثم إلى أن يفترض على جميع أهل الإسلام شرقا وغربا على هذا التدريج." [15]

"اس کے بعد جب نفیر عام ہو گی تو جو مسلمان دشمن کے قریب ہوں گے اور وہ دشمن سے مقابلے پر قادر بھی ہوں تو ان پر جہاد فرض عین ہو جائے گا، ان کے علاوہ جو ان سے دوری پر ہیں ان پر فرض نہ ہو گا تاآنکہ ان کی ضرورت پڑے، یا تو قریب والوں کے دشمن کے مقابلے سے عاجز ہو جانے کی وجہ سے یا ان کی سستی کی وجہ سے، اس وقت ان سے قریب جو ہیں ان پر فرض ہو جائے گا، اس کے بعد ان سے قریب جو ہیں ان پر، اس کے بعد ان سے قریب جو ہیں ان پر...... اس طرح یکے بعد دیگرے مشرق و مغرب کے ہر مسلمان پر فرض ہو جائے گا۔"

موسوعہ فقہیہ کویتیہ کی عبارت ملاحظہ کیجیے:

"إذا استولى الكفار على بقعة من دار الإسلام صار الجهاد فرض عين على جميع أفراد الناحية التي استولى عليها الكفار، رجالا ونساء، صغارا وكبارا، أصحاء ومرضى، فإذا

"جب کفار دارالاسلام کے کسی خطے پر غالب ہو جائیں تو جس علاقے پر کفار نے حملہ کیا اس علاقے کے ہر فرد پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے، مرد عورت، چھوٹے بڑے، تندرست بیمار سب پر۔ اگر اس علاقے کے

[15] العناية شرح الهداية كتاب السير

لم يستطع أهل الناحية دفع العدو عن دار الإسلام، صار الجهاد فرض عين على من يليهم من أهل النواحي الأخرى من دار الإسلام، وهكذا حتى يكون الجهاد فرض عين على جميع المسلمين، ولا يجوز تمكين غير المسلمين من دار الإسلام. ويأثم جميع المسلمين إذا تركوا غيرهم يستولي على شيء من دار الإسلام

....

ولا يجوز لغير المسلمين دخول دار الإسلام إلا بإذن من الإمام أو أمان في مسلم. ولا يجوز لهم إحداث دور عبادة لغير المسلمين: كالكنائس، والصوامع، وبيت النار،..." [١٦]

مسلمان دارالاسلام سے دشمن کو ہٹانے پر قادر نہ ہوں تو ان سے ملے ہوئے دارالاسلام کے قریبی علاقوں کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جائے گا، اسی طرح سب مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہو جائے گا اور کفار کو دارالاسلام میں جگہ کر لینے کے لیے فرصت دینا جائز نہیں، اگر غیر مسلموں کو دارالاسلام کے کسی حصہ پر جگہ کر لینے کے لیے چھوڑ دے تو سب مسلمان گناہ گار ہوں گے۔

......

اور غیر مسلموں کے لیے دارالاسلام میں داخل ہونا امام المسلمین کی اجازت یا کسی مسلمان کی امان کی ماتحتی کے بغیر جائز نہیں، اسی طرح غیر مسلموں کی عبادت گاہیں بنانا بھی جائز نہیں جیسے گرجا، مندر، آگ خانہ وغیرہ......"

مذکورہ نصوص کی رو سے اگر دشمن کسی دارالاسلام پر مسلط ہو جائے تو اہل دارالاسلام پر واجب ہے کہ دشمن کے ساتھ مقابلہ کر کے دارالاسلام کو دوبارہ حاصل کریں اور یہ فرض عین ہے۔ اسی طرح یہ بھی واضح ہے کہ اگر دارالاسلام کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش چھوڑ کر دشمنانِ اسلام کے حوالے کر دیا جائے تو ہر مسلمان گناہ گار ہو گا۔ اس بارے میں فقہ کی عبارت اس طرح ہے: ويأثم جميع المسلمين إذا تركوا غيرهم يستولي على شيء من دار الإسلام۔ لہٰذا برِّصغیر کے مسلمانوں کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ فرضِ عین جہاد کی ادائیگی کے لیے میدان میں اتریں اور اس کے لیے مطلوب تیاری بہم پہنچائیں۔

---

[١٦] الموسوعة الفقهية الكويتية في كلمة دار

چونکہ ان ممالک کے حکمران ان ملکوں کو دارالاسلام بنانے پر تیار نہیں ہیں لہٰذا ان ممالک کے حکمرانوں کے خلاف مسلح کارروائی شروع کرنا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ مسلمانوں کے لیے موجودہ حالات میں جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے، لہٰذا برِّ صغیر کے مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہے۔

دوسری ذمہ داری: کافر اور مرتد حکمرانوں کو حکومت سے ہٹانے کے لیے جہاد کرنا

علماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ مسلمانوں پر اگر کوئی کافر حکمران مسلط ہو جائے یا مسلم حکمران پر کفر طاری ہو جائے تو اس کو ہٹا کر ایک مسلمان حکمران کو مسند اقتدار پر بٹھانا فرض ہے، قاضی عیاضؒ کی ایک عبارت ملاحظہ ہو:

"لا خلاف بين المسلمين أنه لا تنعقد الإمامة للكافر، ولا تستديم له إذا طرأ عليه، وكذلك إذا ترك إقامة الصلوات والدعاء إليها، وكذلك عقد جمهورهم البدعة.
وذهب بعض البصريين إلى أنها تنعقد لها وتستديم على التأويل، فإذا طرأ مثل هذا على وال من كفر أو تغير شرع أو تأويل بدعة، خرج عن حكم الولاية وسقطت طاعته، ووجب على الناس القيام عليه وخلعه، ونصب إمام عدل أو والي مكانه إن أمكنهم ذلك." [١٧]

"مسلمانوں کے اندر اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ کافر کے لیے امامت منعقد نہیں ہوتی اور کسی مسلمان حکمران کی امامت باقی نہیں رہتی جب اس پر کفر طاری ہو جائے، اسی طرح جب نماز قائم کرنا اور اس طرف بلانا چھوڑ دے تو اس کے لیے امامت منعقد نہیں ہوتی، اسی طرح بدعت میں بھی جمہور کا یہی مذہب ہے۔
بعض بصری علماء کا مذہب ہے کہ تاویل کی بنا پر بدعتی کی امامت منعقد ہوگی اور باقی رہے گی لہٰذا اگر اسی طرح کفر یا شریعت کو بدل دینے یا بدعت کی تاویل کسی مسلم والی میں پائی جائے تو وہ ولایت سے نکل جائے گا اور اس کی اطاعت ساقط ہو جائے گی اور مسلمانوں پر اس کے خلاف کھڑے ہونا، اس کو معزول کرنا اور اس

[١٧] إكمال المعلم شرح صحيح مسلم للقاضي عياض

کی جگہ کسی امامِ عادل کو مقرر کرنا واجب ہو جائے گا،
اگر یہ ان کے لیے ممکن ہو۔"

قاضی عیاضؒ نے یہاں امت کا متفقہ فیصلہ ذکر کیا ہے کہ اگر کافر حکمران مسلمانوں پر مسلط ہو جائے یا مسلم حکمران پر کفر طاری ہو جائے تو اس کو ہٹا کر کسی مسلمان حکمران کو تختِ حکومت پر بٹھانا مسلمانوں پر فرض ہے اور ظاہر بات ہے کہ ایک کافر یا مرتد حاکم کو تختِ حکومت سے ہٹانا مسلح کارروائی کے بغیر ممکن نہیں، لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ ان حکمرانوں کے خلاف جہاد کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ برِّ صغیر کے حکمرانوں کے کافر یا مرتد ہونے کے بارے میں ہم پہلے مفصل عرض کر آئے ہیں، اب موضوع کی مناسبت سے مختصراً اس طرف دوبارہ اشارہ کرتا ہوں۔

بھارت کا حکمران کافرِ اصلی ہے، مشرکِ معلن ہے، اس کے کفر کے بارے میں تردد کرنا کفر ہے۔ کافر کو کافر سمجھنا فرض ہے۔ اور پاکستان و بنگلہ دیش کے حکمران اگر پیدائشی طور پر مسلمان تھے بھی تو وہ مرتد ہو چکے ہیں، اگرچہ وہ خود کو مسلمان ظاہر کریں اور اسلام کے بعض ارا کین پر عمل بھی کریں تب بھی وہ مرتد ہیں کیونکہ ان میں کفرِ بواح موجود ہے۔ سلف و خلف کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اگر کوئی حکمران ملک کو چلانے کے لیے شریعت اسلامیہ یعنی قرآن اور سنت کو یعنی حکمِ الٰہی کو دستور کے طور پر اختیار نہ کرے اور اس کے بجائے غیر اللہ کے احکام اختیار کرے تو وہ کافر ہے۔ اس بارے میں آپ سلف و خلف کی کچھ عبارات ملاحظہ فرمائیں:

حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

"امر مخل بالامامت:

۱. اختیاری یعنی خلع بلا سبب
۲. غیر اختیاری مثل مرض مانع عن العمل واسر ممتد وعجز عن العمل
۳. کفر
۴. غیر متعدی الی الغیر مثل شرب خمر وغیرہ

۵. متعدی یعنی ظلم باخذ الاموال اجتہادی

۶. متعدی یعنی ظلم باخذ الاموال غیر اجتہادی

۷. بالاکراہ علی المعصیة

قسم ثالث: نعوذ باللہ کافر ہو جاوے خواہ بکفر تکذیب و جحود و خواہ بکفر عناد و مخالفت خواہ بکفر استخفاف و استقباح امور دین......"

قسم ثالث کا حکم: حکمران معزول ہو جاوے گا اور اگر جدا نہ ہو تو (مسلمانوں پر) بشرط قدرت جدا کر دینا علی الاطلاق واجب ہے۔لقوله فی العبارة الثالثة كالردة۔ مگر اس میں شرط یہ ہے کہ وہ کفر متفق علیہ ہو،بدليل الحديث الاول كفرا بواحا عندكم من الله فيه برہان مع انضمام الاجماع المذكور سابقا۔ اور جس طرح اس کا کفر ہونا قطعی ہو اسی طرح اس کا صدور بھی یقینی ہو، مثل رؤیت عین کے،نہ کہ محض روایات ظنیہ کے درجہ میں،كما دل عليه قوله عليه السلام: إلا إن ترو المراد روية العين، بدليل تعديته إلى مفعول واحد۔"[۱۸]

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب (مدّ ظلہ العالی) لکھتے ہیں:

"اس کے علاوہ حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں کہ ایک اور صورت ایسی ہے جس میں امیر کا فسق دوسروں تک متعدی ہو رہا ہو، یعنی امیر لوگوں کا دین خراب کر رہا ہو، مثلاً لوگوں کو معصیت پر مجبور کر رہا ہو تو اگر یہ عمل کسی ایک یا دو افراد کے ساتھ ہو تو اس کا حکم اکراہ کا ہو گا اور اکراہ کے احکام جاری ہوں گے، لیکن اگر امیر نے اس کو ایک مستقل پالیسی بنا لیا کہ وہ مستقل طور سے لوگوں کو معصیتوں پر مجبور کرنے لگا ہے اور اس میں غیر اسلامی قوانین کو شریعت کے مقابلے

[۱۸] امداد الفتاوی جلد ۵، ص ۱۳۳

میں زیادہ بہتر سمجھتا ہے تو یہ کفر صریح ہے اور اگر فوقیت نہیں دیتا لیکن تاویلاً (شریعت کی غلط تشریح کرکے) یا تکاسلاً (سستی کی بنا پر) اس کو چھوڑا ہوا ہے تو بھی اگرچہ یہ کفر صریح نہ ہو، لیکن کفر کے حکم سے ملحق ہو سکتا ہے، کیونکہ اس سے شریعت کا استخفاف لازم آتا ہے، لہٰذا اس صورت میں بھی خروج جائز ہے......"[19]

مفتی کفایت اللہؒ کا فتوی ملاحظہ ہو:

"خلاف شرع حکم کرنے والے حکمران طاغوت ہیں، ان کو 'اولی الامر' میں داخل کرنے والے کی امامت ناجائز ہے۔"

سوال: جو شخص آیت شریفہ ﴿وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ﴾ کو حکام آئین پر محمول کرتا ہو اور حکام آئین موجودہ کے حکم کو اس آیت شریفہ سے استدلال کر کے واجب العمل کہتا ہو تو ایسے شخص کا شریعت میں کیا حکم ہے اور اس شخص کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ (المستفتی نمبر ۱۴۶۲، مولوی محمد شفیع صاحب مدرس اول مدرسہ اسلامیہ شہر ملتان ۲۳ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ، بمطابق ۳جون ۱۹۳۷ء)

جواب: ﴿وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ﴾ سے علماء یا حکام مسلمین مراد ہیں۔ یعنی ایسے حکام جو مسلمان ہوں اور خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے موافق احکام جاری کریں۔ ایسے مسلمان حاکم جو خدا اور رسول کے احکام کے خلاف حکم جاری کریں ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ میں داخل ہیں اور خدا اور سول کے خلاف حکم جاری کرنے والوں کو قرآن پاک میں طاغوت فرمایا گیا ہے اور طاغوت کی اطاعت حرام ہے۔ پس جو شخص ایسے حکام کو جو الٰہی شریعت اور آسمانی قانون کے خلاف حکم کرتے ہیں ﴿وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ﴾ میں داخل قرار دے وہ قرآن

[19] اسلام اور سیاسی نظریات، ص ۳۶۷

پاک کی نصوص صریحہ کی مخالفت کرتا ہے۔ انگریزی قانون کے ماتحت خلاف شرع حکم کرنے والے خواہ غیر مسلم ہوں خواہ نام کے مسلمان، طاغوت ہیں اور اولی الامر میں کسی طرح داخل نہیں ہوسکتے۔ ان کو اولی الامر میں داخل کرنے والا یا مجنون ہے یا جاہل یا فاسق اور ایسی حالت میں اس کو مقتدا بنانا اور امام مقرر کرنا ناجائز ہے۔ فقط محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ۔ [۲۰]

مفتی رشید احمد لدھیانویؒ کا فتویٰ:

سوال: حکومت برما اپنے مسلم باشندوں پر ظلم کررہی ہے حتیٰ کہ ان کے مذہبی احکام پر پابندی لگا رہی ہے، فرائض شرعیہ کی ادائیگی میں مانع ہورہی ہے، دریں حالات مسلم باشندوں پر ایسی حکومت سے جہاد کرنا فرض ہے یا نہیں؟ نیز اموال زکوٰۃ کے ذریعے ایسے مجاہدین کی مدد کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ بینوا تؤجروا۔

الجواب باسم ملہم الصواب: ان حالات میں ایسی حکومت کافرہ سے جہاد کرنا فرض ہے، اس مقصد کے لیے ایسی تنظیم ضروری ہے جو علمائے ماہرین، متقینین و اہل بصیرت کی نگرانی میں حدود شریعت کے اندر کام کرے، دوسرے ممالک کے مسلمانوں پر بھی بالترتیب 'الاقرب فالاقرب' تعاون کرنا فرض ہے اور جہاد کی استطاعت نہ ہو تو وہاں سے ہجرت کرنا فرض ہے......" [۲۱]

امام ابن کثیرؒ کی تصریح:

[۲۰] کفایۃ المفتی، جلد ۱، ص ۱۳۹

[۲۱] احسن الفتاوی، ج ۶، ص ۲۸

ابن کثیرؒ نے اس بارے میں بہت مفصل اور مبین بات کی، آپ آیت کریمہ ﴿اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"قوله: ﴿اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ﴾ ينكر تعالى على من خرج عن حكم الله المحكم المشتمل على كل خير، الناهي عن كل شر وعدل إلى ما سواه من الآراء والأهواء والاصطلاحات، التي وضعها الرجال بلا مستند من شريعة الله، كما كان أهل الجاهلية يحكمون به من الضلالات والجهالات، مما يضعونها بآرائهم وأهوائهم، وكما يحكم به التتار من السياسات الملكية المأخوذة عن ملكهم جنكزخان، الذي وضع لهم اليساق وهو عبارة عن كتاب مجموع من أحكام قد اقتبسها عن شرائع شتى، من اليهودية والنصرانية والملة الإسلامية، وفيها كثير من الأحكام أخذها من مجرد نظره وهواه، فصارت في بنيه شرعا متبعا، يقدمونها على الحكم بكتاب الله وسنة رسوله صلى الله عليه وسلم. ومن فعل ذلك منهم فهو كافر يجب قتاله، حتى يرجع إلى حكم الله ورسوله [صلى الله عليه وسلم]فلا يحكم سواه في قليل ولا كثير." [22]

"(اس آیتِ مبارک)'تو کیا یہ جاہلیت کے فیصلے چاہتے ہیں؟ اور اللہ کے حکم (اور فیصلے) سے بہتر کس کا حکم ہو سکتا ہے، ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھنے والے ہیں'، اللہ رب العالمین ان لوگوں پر نکیر فرما رہے ہیں جو اللہ کے حکم، جس میں تمام بھلائیاں موجود اور تمام برائیاں مفقود ہیں، سے ہٹ جائیں۔ ایسے پاک حکم سے ہٹ کر رائے قیاس کی طرف، خواہش نفسانی کی طرف اور ان احکام کی طرف جھکے جو لوگوں نے از خود اپنی طرف سے بغیر دلیلِ شرعی گھڑ لیے ہیں جیسا کہ اہل جاہلیت اپنی جہالت و ضلالت اور اپنی رائے اور اپنی مرضی کے مطابق حکم احکام جاری کر لیا کرتے تھے اور جیسا کہ تاتاری ملکی معاملات میں چنگیز خان کے احکام کی پیروی کرتے تھے جو الیاسق میں مختلف شریعتوں اور مذاہب سے چھانٹ کر وضع کیے گئے تھے۔ یہودیت، نصرانیت، اسلامیت وغیرہ سب کے احکام کا وہ مجموعہ تھا اور پھر اس میں بہت سے احکام وہ بھی تھے جو صرف اپنی عقل اور مصلحت وقت کے پیش نظر ایجاد کیے گئے تھے جن میں اپنی خواہش کی

[22] تفسير القرآن العظيم لابن كثير

ملاوٹ بھی تھی۔ پس وہی مجموعہ ان کی اولاد میں قابل عمل ٹھہرا اور اسی کو کتاب و سنت پر فوقیت اور تقدیم دی گئی۔ در حقیقت ایسا کرنے والے کافر ہیں اور ان سے جہاد کرنا واجب ہے یہاں تک کہ وہ لوٹ کر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی طرف آجائیں اور کسی چھوٹے یا بڑے، اہم یا غیر اہم معاملے میں سوائے کتاب و سنت کے کوئی حکم کسی کا نہ لیں۔"

تو یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ان تینوں ملکوں (بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش) کے حکام یا تو اصلاً کافر ہیں یا مرتد ہیں، ہر دو صورت میں ان کو اقتدار سے ہٹا کر کسی مسلمان کو حکمران بنانا مسلمانوں پر واجب ہے اور اس سلسلے میں جو کچھ تدابیر ضروری ہیں ان سب کا فراہم کرنا فرض ہے۔ چونکہ یہ مقصد بغیر جہاد کے حاصل کرنا ممکن نہیں لہٰذا برِّ صغیر کے کافر اور مرتد حکمرانوں کے خلاف جہاد کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔

اگر کوئی اس مسئلے میں اختلاف کرے اور مسلمانی کا دعویٰ کرنے والے حکمرانوں کو کافر ماننے پر تیار نہ ہو تو اس قسم کے اختلاف سے ان حکمرانوں کے خلاف جہاد کی فرضیت کے مسئلے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بھارت کے حق میں تو یہ مسئلہ واضح ہے لہٰذا وہاں کے حکمرانوں کے خلاف جہاد کی فرضیت میں ان حضرات کو اختلاف نہیں ہونا چاہیے اور جو حکمران خود کو مسلمان کہتے ہیں ان کے حق میں بھی فرضیت کے مسئلے کی حیثیت برابر ہے کیونکہ یہ خلافت اسلامیہ اور امارت اسلامیہ کی اقامت کے مانعین ہیں اور حکم الٰہی کی اقامت کی راہ میں جو بھی مانع ہو گا اس کے خلاف جہاد کرنا فرض ہے، لہٰذا ان حکمرانوں کے خلاف فرضیت جہاد کے مسئلہ میں ان حضرات کو اختلاف نہیں کرنا چاہیے۔

آپ نے دیکھا کہ افغانستان میں امریکی شیاطین سے ان کے انخلا کے معاہدہ (معاہدۂ دوحہ) کے نتیجے میں جنگ بندی کے بعد بھی امارت اسلامیہ کے مجاہدین نے جہاد موقوف نہیں کیا، جبکہ ان کی لڑائی ایسے لوگوں کے خلاف چل رہی تھی جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں، اس لڑائی کے بارے میں طالبان مجاہدین کا یہی کہنا تھا کہ امارت اسلامیہ

کی اقامت کے لیے ان سے لڑائی ہے لہٰذا جب تک امارت اسلامیہ مستحکم نہ ہو گی تب تک جہاد چلتا رہے گا اور یہ جہاد ان لوگوں کے خلاف ہو گا جو امارت اسلامی کی اقامت کے لیے خطرہ ہیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ افغان ملی فوجیوں کے خلاف طالبان مجاہدین کے اس رویہ کی پاکستان اور بنگلہ دیش کے علمائے کرام نے تائید کی اور مفتی محمد تقی عثمانی صاحب (مدظلہ) اور دوسرے علماء حضرات بھی افغان فوجیوں کی تکفیر تو نہیں کرتے مگر طالبان کے اقدام کی تائید ضرور کرتے ہیں۔ لہٰذا اسلام کا دعویٰ کرنے والے حکمرانوں کی تکفیر میں اختلاف رکھنے والے حضرات کو بھی یہ بات تسلیم کرنی ہو گی کہ ان حکمرانوں کے خلاف جہاد فرض ہے۔

تیسری ذمہ داری: اقامت خلافت اور امارت اسلامیہ کا قیام

مسلمان جب اجتماعی طور پر کسی خطۂ زمین میں بستے ہیں تو ان کی ایک اجتماعی حیثیت بھی ہوتی ہے اور اسی حیثیت پر کچھ شرعی احکامات بھی لاگو ہوتے ہیں، جنہیں نفاذ شریعت یا اقامت امارت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس بارے میں قرآن و حدیث اور فقہ جو فیصلہ کرتی ہے اس کو نہایت اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

قرآن کیا کہتا ہے؟

نوع انسانی کا وجود، حکم الٰہی کی تنفیذ کی ذمہ داری، حکم الٰہی کی تغلیب، ارسال رسول کا مقصد اصلی سارے ادیان و احکام پر حکم الٰہی کی ترجیح، کفار مشرکین اور خواہشات نفسانی کے خلاف حکم الٰہی کا نفاذ، ہر چھوٹی بڑی بات میں اللہ کی حاکمیت اور رسول کی خلافت اور امت کی نیابت اور حکم الٰہی سے تخلف کے نتیجے کا بیان...... یہ کچھ باتیں ایسی ہیں کہ جن کے بارے میں قرآن کریم پلٹ پلٹ کر توجہ دلاتا ہے اور ان امور میں قرآن کی راہنمائی واضح صاف اور شفاف ہے، مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ کریں:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ

”اور یاد کرو جب کہ کہا تھا تمہارے رب نے فرشتوں سے کہ میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک خلیفہ۔ انہوں نے کہا: کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر

نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾(سورۃ البقرۃ:۳۰)

کرنے والے ہیں جو اس میں فساد مچائے گا اور خون ریزی کرے گا؟ اور ہم آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس میں لگے ہوئے ہیں۔ فرمایا: میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔"

وفي تفسير الجلالين:

{و} اذكر يا محمد {إذ قال ربك للملائكة إني جاعل في الأرض خليفة} يخلفني في تنفيذ أحكامي فيها.

اور تفسیرِ جلالین میں ہے:

"(اور) یاد کرو اے محمدؐ! (جب کہا تیرے رب نے فرشتوں سے کہ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں) جو زمین میں میرے احکام کی تنفیذ میں میری نیابت کرے گا۔"

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾(سورۃ التوبۃ: ۳۳)

"وہ اللہ وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا کہ اسے وہ غالب کر دے سارے بقیہ دینوں پر خواہ مشرکوں کو (کیسا ہی) ناگوار ہو۔"

﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا﴾(سورۃ الفتح:۲۸)

"وہ (اللہ) وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے اور اللہ کافی گواہ ہے۔"

﴿وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُصِيبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ﴾ (سورۃ المائدۃ:۴۹)

" اور فیصلے کیجیے ان کے مابین اس (شریعت) کے مطابق جو کہ اللہ نے اتاری ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے اور ان سے ہوشیار رہیے، ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ آپ کو ان میں سے کسی چیز سے بچلا دیں جو اللہ نے آپ پر نازل کی ہیں پھر اگر وہ رو گردانی کریں تو جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے بعض گناہوں کی

سزا دینا چاہتا ہے اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے کہ لوگوں میں سے اکثر فاسق (نافرمان) ہیں۔"

﴿فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾(سورۃ المائدۃ:۴۴)

"......(تو ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ) تم لوگوں سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور میری آیات کو حقیر سی قیمت پر فروخت نہ کرو اور جو اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں۔"

حدیث کی رہنمائی

اسی طرح احادیث نبویہ میں خلافت اور امارت اسلامیہ کی ایسی تصویر پیش کی گئی ہے جس کے بعد امت کے لیے تشویش اور تشکیک کا کوئی گوشہ باقی نہیں رہتا۔

امیر و خلیفہ کا وصف، امام کی ذمہ داری، سیاست کی کیفیت، اطاعت کی کیفیت، سیاست اور اطاعت کی اہمیت، عدم سیاست اور عدم اطاعت پر دھمکی، امیر کے لیے حدود سیاست، مامور کے لیے حدود اطاعت، اجتماعی زندگی کی اہمیت، امیر کے بغیر اجتماعی زندگی کا تصور ناممکن ہونا، خلافت، بیعت، وفائے بیعت، بغاوت کا وجوب، جواز، حرمت وغیرہ سیاسی امور سے حدیث کے مستقل ابواب بھرے ہوئے ہیں۔یعنی حدیث نبوی میں سیاست کا ایسا کوئی گوشہ مہمل نہیں چھوڑا گیا جس کے بارے میں ہمیں تردد کرنا پڑے،فللّٰہ الحمد۔ آپ مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ کرتے جائیں اور حقیقت کا مشاہدہ کرتے جائیں:

"عن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه و سلم: من أطاعني فقد أطاع الله ومن عصاني فقد عصى الله ومن يطع الأمير فقد أطاعني ومن يعص الأمير فقد عصاني وإنما الإمام جنة يقاتل من ورائه ويتقى به فإن أمر

"ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی، اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی، امام ڈھال ہے جس کے پیچھے رہ

بتقوى الله وعدل فإن له بذلك أجرا وإن قال بغيره فإن عليه منه۔" [٢٣]

کر لڑائی کی جاتی ہے اور اس کے ذریعے بچاؤ کیا جاتا ہے، پس اگر امام اللہ سے ڈرنے اور عدل و انصاف (قائم کرنے) کا حکم دے تو اس کے لیے اجر و ثواب ہے اور اگر اس کے خلاف کرے تو اس پر اس کا وبال ہو گا۔"

"وعن أم الحصين قالت: قال رسول الله صلى الله عليه و سلم: إن أمر عليكم عبد مجدع يقودكم بكتاب الله فاسمعوا له وأطيعوا۔" [٢٤]

"ام الحصینؓ سے روایت ہے، وہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم پر کسی کان کٹے غلام کو بھی امیر بنا دیا جائے جو تمہیں کتاب اللہ کی روشنی میں چلائے تو تم اس کی بات مانو اور اس کی اطاعت کرو۔"

"وعن ابن عمر رضي الله عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه و سلم : السمع والطاعة على المرء المسلم فيما أحب وأكره ما لم يؤمر بمعصية فإذا أمر بمعصية فلا سمع ولا طاعة۔"[٢٥]

"ابن عمرؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان شخص پر پسند اور ناپسند ہر حال میں سمع و طاعت واجب ہے جب تک کہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے، پس جب معصیت کا حکم دیا جائے تو اس میں کوئی سمع و طاعت نہیں۔"

"وعن عبادة بن الصامت قال: بايعنا رسول الله صلى الله عليه و سلم على السمع والطاعة في العسر واليسر والمنشط والمكره وعلى أثرة علينا وعلى أن لا ننازع الأمر أهله وعلى أن نقول بالحق أينما كنا لا نخاف في الله لومة

"عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ان امور میں بیعت کی کہ ہم سمع و طاعت کریں گے سختی میں بھی اور کشادگی میں بھی، اگرچہ ہمیں پسند ہو یا

[٢٣] صحيح البخاري، كتاب الجهاد والسير، باب يقاتل من وراء الإمام ويتقى به

[٢٤] صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب وجوب طاعة الأمراء في غير معصية وتحريمها في معصية

[٢٥] صحيح البخاري كتاب الجهاد والسير، باب السمع والطاعة للإمام، وصحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب وجوب طاعة الأمراء في غير معصية وتحريمها في معصية

لائم . وفي رواية: وعلى أن لا ننازع الأمر أهله إلا أن تروا كفرا بواحا عندكم من الله فيه برهان۔" [٢٦]

ناپسند، اور اگرچہ ہم پر دوسروں کو ترجیح ہی دی جائے اور اس بات پر کہ ہم خلافت اور امارت کے امور میں ارباب حکومت سے لڑائی جھگڑا نہ کریں گے اور اس بات پر کہ ہم جہاں بھی ہوں حق بات ہی کہیں گے اور حق کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروانہ کریں گے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اور اس بات پر کہ ہم خلافت اور امارت کے امور میں ارباب حکومت سے لڑائی جھگڑا نہ کریں گے الا یہ کہ تم حکمرانوں میں ایسا واضح کفر دیکھو جس کے بارے میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے دلیل موجود ہے۔"

"وعن ابن عباس قال: قال رسول الله صلى الله عليه و سلم: من رأى أميره يكرهه فليصبر فإنه ليس أحد يفارق الجماعة شبرا فيموت إلا مات ميتة جاهلية۔"

"ابن عباسؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کوئی یہ دیکھے کہ اس کا امیر اسے کسی ناپسندیدہ امر پر مجبور کر رہا ہے تو چاہیے کہ وہ صبر کرے کیونکہ جو کوئی بھی جماعت سے بالشت بھر بھی دوری اختیار کرے اور اسی حالت میں مر جائے تو اس موت جاہلیت کی موت ہے۔"

"وعن عبد الله بن عمر قال : سمعت رسول الله صلى الله عليه و سلم يقول: من خلع يدا من طاعة لقي الله يوم القيامة ولا حجة له .

"عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ جس نے امیر کی اطاعت سے ہاتھ ہٹالیا وہ قیامت کے دن اس حال میں اللہ رب العزت کے حضور پیش ہوگا کہ اس کے حق میں کوئی

[٢٦] المصدر السابق

ومن مات وليس في عنقه بيعة مات ميتة جاهلية۔"[٢٧]

حجت نہ ہو گی اور جو کوئی اس حال میں مرا کہ اس کے گلے میں (امام المسلمین کے ہاتھ پر) بیعت کا قلادہ نہیں ہے وہ جاہلیت کی موت مرا۔"

"وعن أبي هريرة عن النبي صلى الله عليه و سلم قال: كانت بنو إسرائيل تسوسهم الأنبياء كلما هلك نبي خلفه نبي وإنه لا نبي بعدي وسيكون خلفاء فيكثرون، قالوا : فما تأمرنا؟ قال: فوا بيعة الأول فالأول أعطوهم حقهم فإن الله سائلهم عما استرعاهم۔" [٢٨]

"ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کے امور حکومت ان کے انبیاء سنبھالتے تھے۔ جب بھی ایک نبی ہلاک ہو جاتا تو دوسرا نبی اس کے بعد اس کا خلیفہ بن جاتا۔ اور میرے بعد بے شک کوئی نبی نہ آئے گا۔ ہاں خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے۔ صحابہ نے عرض کیا: پھر آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ ارشاد فرمایا: پہلے والے کی بیعت کی وفاداری کرو، پھر اس کے بعد والے کی بیعت کی وفاداری کرو اور ان کو ان کا حق دو جو اللہ نے ان کا حق رکھا ہے۔ بیشک اللہ بھی ان سے ان کی رعیت کے حقوق کے بارے میں باز پرس کرے گا۔"

"وعن أبي سعيد قال: قال رسول الله صلى الله عليه و سلم: إذا بويع لخليفتين فاقتلوا الآخر منهما۔"[٢٩]

"ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب دو خلفاء کے ہاتھ پر بیعت کی جائے تو ان دونوں میں سے بعد میں بیعت لینے والے کو قتل کر دو۔"

"وعن عبد الله بن عمرو قال: قال رسول الله صلى الله عليه و سلم: من بايع إماما فأعطاه

عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس نے امام کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر خلوص

[٢٧] المصدر السابق

[٢٨] المصدر السابق

[٢٩] صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب إذابويع لخليفتين

صفقة يده وثمرة قلبه فليطعه إن استطاع فإن جاء آخر ينازعه فاضربوا عنق الآخر۔"[٣٠]

دل کے ساتھ بیعت کی تو چاہیے کہ اپنی استطاعت کے مطابق اس کی اطاعت کرے اور اگر دوسرا شخص اس سے جھگڑا کرے تو دوسرے کی گردن مار دو۔"

"عن الحارث الأشعري قال: قال رسول الله صلى الله عليه و سلم: آمركم بخمس: بالجماعة والسمع والطاعة والهجرة والجهاد في سبيل الله وإنه من خرج من الجماعة قيد شبر فقد خلع ربقة الإسلام من عنقه إلا أن يراجع ومن دعا بدعوى الجاهلية فهو من جثى جهنم وإن صام وصلى وزعم أنه مسلم۔"[٣١]

"حضرت حارث اشعری کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں: جماعت کو لازم پکڑنے کا، سمع و طاعت کا، ہجرت کا، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا اور جو شخص ملت کی اجتماعی ہیئت سے بالشت بھر بھی الگ ہوا اس نے (گویا) اسلام کی رسی کو اپنی گردن سے نکال دیا الاّیہ کہ وہ واپس آجائے اور جو شخص جاہلیت کی طرف دعوت دے وہ (گویا) دوزخیوں کی جماعت کا فرد ہے اگرچہ وہ روزے رکھے، نماز پڑھے اور یہ کہے کہ میں مسلمان ہوں۔"

"أبو سعيد الخدري رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا خرجَ ثلاثة في سفر فليُؤَمِّروا أحدهم۔"[٣٢]

"ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تین آدمی سفر کے لیے نکلیں تو چاہیے کہ اپنے میں سے ایک کو امیر مقرر کرلیں۔"

[٣٠] صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب الوفاء ببيعة الخلافاء الأول فالأول

[٣١] سنن الترمذي، كتاب الأمثال عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ما جاء في الصلاة والصيام والصدقة، ومسند أحمد في مسند الحارث الأشعري

[٣٢] سنن أبي داود، كتاب الجهاد، باب في القوم يسافرون يؤمرون أحدهم

فقہ واجتہاد کا فیصلہ

مذکورہ بالا آیات و احادیث سے ہر زمانے کے مجتہدین، مفسرین اور محدثین نے جو مسائل اخذ کیے ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

"اعْلَم أَنه يجب أَن يكون فِي جمَاعَة الْمُسلمين خَليفَة لمصَالح لَا تتمّ إِلَّا بِوُجُودِهِ، وَهِي كَثِيرَة جدا يجمعها صنفان:
أَحدهمَا مَا يرجع إِلَى سياسة الْمَدِينَة من ذب الْجنُود الَّتِي تغزوهم وتقهرهم، وكف الظَّالِم عَن الْمَظْلُوم، وَفصل القضايا، وَغير ذَلِك،....
وَثَانِيهمَا مَا يرجع إِلَى الْملَّة، وَذَلِكَ أَن تنويه دين الْإِسْلَام على سَائِر الْأَدْيَان لَا يتَصَوَّر إِلَّا بِأَن يكون فِي الْمُسلمين خَليفَة يُنكر على من خرج من الْملَّة، وارتكب مَا نصت على تَحْرِيمه أَو ترك مَا نصت على افتراضه أَشد الانكار، ويذل أهل سَائِر الْأَدْيَان وَيَأْخُذ مِنْهُم الْجِزْيَة عَن يَد وهم صاغرون، وَإِلَّا كَانُوا متساوين فِي الْمرتبَة لَا يظْهر فيهم رُجْحَان إِحْدَى الفرقتين على الْأُخْرَى، وَلم يكن كابح يكبحهم عَن عدوانهم. [33]

"جان لو کہ مسلمانوں کی جماعت میں ایک خلیفہ ہونا واجب ہے کچھ ایسی مصلحتوں کی وجہ سے جو خلیفۃ المسلمین کے بغیر ادا نہیں ہوسکتیں اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، یہ دو قسم کی ہیں:
ایک سیاست مدنیہ سے متعلق ہے جس میں اس لشکر کو مار بھگانا جو ان کے ساتھ لڑے اور ان پر قابو پانے کی کوشش کرے، مظلوم سے ظالم کا ظلم دور کرنا، عدالتی معاملات کو دیکھنا وغیرہ......
اور دوسرا امت مسلمہ سے متعلق ہے اور وہ یہ کہ دین اسلام کو تمام ادیان پر فائق اور فائز کرنا اور یہ مسلمانوں کے ایک خلیفہ کے بغیر ممکن نہیں جو ان لوگوں پر سخت نکیر کرے جو ملت اسلام سے نکل جائیں، منصوص علیہ محرمات کا ارتکاب کریں یا منصوص علیہ فرائض کو ترک کریں۔ (نیز خلیفۃ المسلمین) دوسرے ادیان کے ماننے والوں کو ذلیل

[33] حجة الله البالغة، من أَبْوَاب سياسة المدن

کرے اور انہیں ذلیل و خوار کرکے ان سے جزیہ وصول کرے، اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو وہ مرتبہ میں (مسلمانوں کے) برابر ہوجائیں گے اور ایک پر دوسرے (یعنی کفار پر مسلمانوں) کی فوقیت ظاہر نہ ہوگی اور ایسی کوئی لگام نہیں ہوگی جو انہیں عداوت سے باز رکھ سکے۔"

امام نسفیؒ فرماتے ہیں:

قال النسفي: والمسلمون لا بد لهم من إمام يقوم بتنفيذ أحكامهم، وإقامة حدودهم، وسد ثغورهم، وتجهيز جيوشهم وأخذ صدقاتهم، وقهر المتغلبة والمتلصصة وقطاع الطريق، وإقامة الجمع والأعياد، وقطع المنازعات الواقعة بين العباد، وقبول الشهادات القائمة على الحقوق، وتزويج الصغار والصغيرات الذين لا أولياء لهم، وقسمة الغنائم، أي ونحو ذلك من الأمور التي لا يتولاها آحاد الأمة.[٣٤]

"مسلمانوں کے لیے ایک امام کا ہونا ضروری ہے جو احکام نافذ کرنے کی ذمہ داری ادا کرے، حدود قائم کرے، سرحدوں کی حفاظت کرے، لشکر تیار کرے، (حق داروں کو) صدقات کی ادائیگی یقینی بنائے اور ظالموں چوروں اور ڈاکوؤں کو قابو میں لانے کے لیے اقدامات کرے، اسی طرح جمعہ وعیدین قائم کرائے، لوگوں کے باہمی تنازعات میں فیصلہ کرائے، حقوق پر شہادت قبول کرائے، جن بچوں اور بچیوں کے ولی نہیں ہیں ان کی شادی کروائے اور غنائم کی تقسیم وغیرہ امور کو ذمہ داری سے ادا کروائے جن کی تولیت امت کے افراد نہیں کرسکتے۔"

الفقه الاسلامی وادلته کی عبارت ملاحظہ کیجیے:

---

[٣٤] شرح العقائد النسفية ص: ٩٦-٩٧

وقال (محمد بن عبد الرحمن بن محمد بن عبد الله الحسني الحسيني) الإيجي (الشافعيّ (المتوفى: ٩٠٥هـ)) في المواقف: «إن في نصب الإمام دفع ضرر مظنون، وإن دفع هذا الضرر واجب شرعاً. وبيان ذلك أننا نعلم علماء يقارب الضرورة أن مقصود الشارع، فيما شرع من المعاملات، والمناكحات، والجهاد، والحدود والمقاصات، وإظهار شعائر الشرع في الأعياد والجماعات، إنما هو مصالح عائدة إلى الخلق معاشاً ومعاداً، وذلك المقصود لا يتم إلا بإمام يكون من قبل الشارع يرجعون إليه فيما تعين لهم»

وهناك برهان آخر يستتبع القيام بالوظيفة المقدسة للبشر: وهو أن مرفق القضاء الذي تقوم به الدولة أمر ضروري لفض المنازعات الدائمة بين البشر، لا سيما بعد زوال النظام القبلي الذي يحكم فيه رئيس القبيلة بالعرف والهوى الشخصي، وعدم جدوى اللجوء إلى التحكيم إذا تعذر اتفاق المتخاصمين، فلم يبق إلا القضاء الذي يلجأ إليه كل إنسان بمفرده.

ومهمة القضاء في الإسلام لا تقتصر على إقامة العدل بالمفهوم الإلهي، وفصل الخصومات، وتطبيق أحكام الشريعة، وإنما يشمل كل ما من شأنه رعاية الحرمات الدينية، واحترام الفضيلة، وإقرار المعروف، ومكافحة المنكرات والفواحش بمختلف ألوانها.

”الایجی نے ’مواقف‘ میں کہا:

امام المسلمین مقرر کرنے پر احتمالی ہر ضرر کا مقابلہ موقوف ہے اور اس ضرر کا مقابلہ کرنا شرعاً واجب ہے۔ اس کی شرح اور تفصیل یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں معاملات، نکاح، جہاد، حدود و قصاص، عید اور جماعت میں شرائع اسلام کا اظہار، ان سب کو مشروع کرنے میں شارع کا مقصد کچھ ایسی مصلحتیں ہیں جو دنیاوی امور اور اخروی امور دونوں سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ مقاصد امام المسلمین کے بغیر پورے نہیں ہوسکتے جو شارع کی طرف سے مقرر کردہ ہو اور جس کی طرف سب ان مسائل میں رجوع کریں جو ان کے ساتھ مخصوص ہیں۔

یہاں ایک اور دلیل ہے جو انسان کی ایک مقدس ذمہ داری بجالانے کو اس کے تحت لاتی ہے اور وہ ہے عدالت کا انتظام جس کے ذریعے ایک حکومت قائم ہوتی ہے، لوگوں کے درمیان جو لڑائی جھگڑے چلتے رہتے ہیں ان کو دور کرنے کے لیے ایک ضروری چیز عدالت ہے، خاص طور پر قبائلی نظام کے ختم ہوجانے کے بعد جس میں قبیلے کا سردار عام رواج اور اپنی خواہشات کے مطابق فیصلہ کرتا تھا، حاکم ماننے میں اگر دو مخالف فریق متفق نہ ہوسکیں تو حاکم کی طرف رجوع کرنا ہی بے کار ہوجاتا ہے، لہٰذا ایک محکمۂ قضا کے علاوہ

فلولا القضاء لاستأصل البشر بعضهم، وهلكوا جميعاً، فكان وجوده رحمة، وتنظيمه فريضة، وقيام الدولة به ووجودها من أجله أمراً محتماً.

وإذا لا حظنا أن مهمة الدولة في الإسلام حراسة شؤون الدين والدنيا، وتحقيق السعادة للبشر في الحياة الدنيا والآخرة، علمنا مدى الأهمية المنوطة بالدولة المستلزمة للسعي الفوري في إيجادها، ولولا ذلك لعمت الفوضى، وشاع الفساد، وانتشر الظلم بين العباد.

والخلاصة: إن تلازم وجود الدولة مع دعوة الإسلام ودين الإسلام أمر لا يمكن فصله في مفهوم إنسان، منذ أن قامت دولة المدينة باعتبارها أول نواة لوجود الدولة بالمعنى الحديث القائم على أركان ثلاثة: هي الشعب، والإقليم (الوطن) والسلطة السياسية أو السيادة. [۳۵]

اور کچھ باقی نہیں رہتا جس کی طرف ہر انسان رجوع کر سکتا ہے اور اس کے پاس پناہ لے سکتا ہے۔

اور اسلام میں قضا کی ذمہ داری صرف عدل و انصاف کی اقامت، خصومات و معاملات کا فیصلہ اور شرعی احکام کی اقامت پر منحصر نہیں بلکہ اس میں ہر وہ چیز شامل ہے جس میں دینی حرمت اور فضائل کے احترام کی رعایت کا تقاضا ہے، معروف کی اقامت اور منکرات و فواحش کی ہر قسم کا استیصال اور قلع قمع موجود ہے۔

پس اگر قضا نہ ہوتا تو انسانیت دیگر انسانیت کا قلع قمع کر ڈالتی اور سب کے سب ہلاک ہو جاتے، لہٰذا اس کا وجود ایک رحمت ہے، اس کا انتظام فرض ہے، اس کے ذریعے حکومت کا قیام اور اسی کی وجہ سے اس کا وجود ایک لازمی امر ہے۔

اور جب ہم دیکھیں گے کہ اسلامی حکومت کی اہم چیز دین اور دنیا کے امور کی پاسبانی اور دنیا و آخرت میں انسانیت کی سعادت کا پیغام دینا ہے تو ہم سمجھ سکیں گے کہ اسلامی حکومت کی اہمیت کس قدر ہے اور اس کے وجود کے لیے جو کوششیں کرنی چاہییں وہ کس قدر فوری ضرورت کی حامل ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو بد نظمی

---

[۳۵] الفقه الإسلامي وأدلته، المبحث الثاني: حكم إقامة الدولة في الإسلام

عام ہو جاتی، فساد برپا ہو جاتا اور بندوں میں ظلم و ستم پھیل جاتا۔
خلاصہ یہ کہ دعوت اسلام اور دین اسلام کے ساتھ دولت و حکومت کا تلازم ایک ایسی چیز ہے جس کو علیحدہ کرنا عقل انسانی میں ممکن نہیں۔"

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

كتاب آداب القاضي الكلام في هذا الكتاب في مواضع، في بيان فرضية نصب القاضي، وفي بيان من يصلح للقضاء، وفي بيان من يفترض عليه قبول تقليد القضاء، وفي بيان شرائط جواز القضاء، وفي بيان آداب القضاء، وفي بيان ما ينفذ من القضايا، وما ينقض منها؛ إذا رفع إلى قاض آخر ، وفي بيان ما يحله القاضي وما لا يحله ، وفي بيان حكم خطأ القاضي في القضاء، وفي بيان ما يخرج به القاضي عن القضاء

(أما) الأول فنصب القاضي فرض؛ لأنه ينصب لإقامة أمر مفروض، وهو القضاء قال الله سبحانه وتعالى: يا داود إنا جعلناك خليفة في الأرض فاحكم بين الناس بالحق. وقال تبارك وتعالى لنبينا المكرم عليه أفضل الصلاة والسلام: {فاحكم بينهم بما أنزل الله } والقضاء هو: الحكم بين الناس بالحق، والحكم بما أنزل الله عز وجل، فكان نصب القاضي؛ لإقامة الفرض، فكان فرضا

"کتاب آداب القاضی میں متعدد جگہوں پر اس بارے میں گفتگو ہے جیسے قاضی مقرر کرنے کے فرض ہونے کا بیان، قاضی ہونے کی لیاقت کا بیان، قاضی کے آداب و شرائط کا بیان، فیصلوں میں سے جن کی تنفیذ ہو گی اور دوسرے قاضی کے پاس جو ملتوی ہو جائے گی ان کا بیان، قاضی جس کو حلال کہتا ہے اور جس کو حلال نہیں کہتا ان کا بیان، فیصلوں میں قاضی کی غلطیوں کا بیان اور جن امور سے قاضی قضا کا حق دار نہیں رہتا ان کا بیان۔

ان میں سے پہلی بات ہے قاضی مقرر کرنا، سو یہ فرض ہے کیونکہ اس کو مقرر کیا جاتا ہے ایک فرض عمل کے لیے اور وہ ہے قضاء اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں: اے داود! ہم نے تم کو زمین پر خلیفہ بنایا لہٰذا تم حق کے ذریعے لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ پھر اللہ تبارک و تعالیٰ ہمارے نبی مکرم علیہ الصلاۃ والسلام کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں: تم لوگوں کے درمیان اس سے

ضرورة؛ ولأن نصب الإمام الأعظم فرض، بلا خلاف بين أهل الحق ، ولا عبرة - بخلاف بعض القدرية -؛ لإجماع الصحابة رضي الله عنهم على ذلك، ولمساس الحاجة إليه؛ لتقيد الأحكام، وإنصاف المظلوم من الظالم، وقطع المنازعات التي هي مادة الفساد، وغير ذلك من المصالح التي لا تقوم إلا بإمام، لما علم في أصول الكلام.[٣٦]

فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے۔ اور قضا یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان حق فیصلہ کرنا اور اللہ نے جو نازل کیا ہے اس سے فیصلہ کرنا، پس قاضی مقرر کرنا فرض کی اقامت کے لیے ہے لہٰذا ضرورتاً یہ فرض ہوا اور چونکہ امام اعظم کا مقرر کرنا فرض ہے اور اس بارے میں اہل علم کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے اور بعض قدریہ جو اختلاف کرتے ہیں اس کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے اور اس کی ضرورت بھی واضح ہے: احکام کی تنفیذ کے لیے، ظالم سے مظلوم کا حق دلوانے کے لیے، آپس کے لڑائی جھگڑوں کو دور کرنے کے لیے جو کہ فساد کی جڑ ہیں وغیرہ مصلحتیں جو امام کے بغیر نہیں ہو سکتیں، جو علم کلام کے اصول سے معلوم ہوتا ہے۔“

ان نصوص سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کسی امام اور حاکم کے بغیر نہیں چل سکتی لہٰذا مسلمانوں کے لیے ایک امام اور حاکم کا تقرر مسلمانوں پر فرض ہے، جب بھی کسی وجہ سے یہ امام اور حاکم موجود نہ ہو تو اس وقت امام اور حاکم مقرر کر لینا ضروری ہے اس کے بغیر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا کوئی تصور نہیں اور اس امام مسلم اور حاکم کے تقرر میں اور اس فرض عمل کو بروئے کار لانے میں جو جو رکاوٹیں پیش آئیں انہیں دور کرنا ضروری ہے۔ یہ رکاوٹیں دور کرنے کے لیے جو تیاری مطلوب ہے وہ کرنا سب مسلمانوں پر فرض ہے۔

---

[٣٦] بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع للكاساني الحنفي ٥٨٧هـ، كتاب آداب القاضي بيان فرضية نصب القاضي

اور ظاہر بات ہے کہ برِّصغیر کے ہر خطے پر مسلمانوں کے امام اور حاکم مقرر کرنا اور شرعی قانون کا نفاذ غیر شرعی اور کفری قوانین کے علم بردار یعنی بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کے حکمرانوں کو ہٹائے بغیر ممکن نہیں اور اس مقصد کے حصول کے لیے جہاد کرنا لازم ہے لہٰذا برِّصغیر کے کافر اور مرتد حکمرانوں کے خلاف جہاد کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔

خلاصہ

اب خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ برِّ صغیر کے حکمرانوں کے خلاف تین ایسی وجہوں سے جہاد کرنا مسلمانوں پر فرض ہے جن میں سے کسی ایک وجہ کا ہونا بھی جہاد کے واجب ہونے کے لیے کافی ہے۔ وہ تین وجوہ اور اسباب جن کی تفصیل ہم بیان کر چکے ہیں وہ یہ ہیں:

۱. مسلمانوں کا اس خطۂ ارض کو (جسے دو سو برس قبل دارالحرب قرار دیا گیا تھا اور جسے دوبارہ دارالاسلام بننا نصیب نہیں ہوا) دارالاسلام بنانے کی راہ میں حائل مانعین اور رکاوٹیں پیدا کرنے والوں کے خلاف جہاد کرنا مسلمانوں پر واجب ہے۔

۲. مسلمانوں کے اس خطۂ زمین کے بعض حکمران کافر معلن مشرک ہیں اور بعض کفر بواح کے مرتکب ہونے کی وجہ سے مرتد ہو چکے ہیں، ان کافر حکمرانوں کو ہٹا کر ایک مسلم حکمران مقرر کرنے کے لیے کافر حکمرانوں کے خلاف جہاد کرنا مسلمانوں پر واجب ہے۔

۳. اس خطۂ زمین میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی ہے، کروڑوں مسلمان یہاں بستے ہیں لیکن ان کا کوئی امام مسلم نہیں جو ان کو حکم الٰہی کے تحت چلائے، صدیوں سے وہ غیر شرعی قوانین کے تحت اور غیر مسلم حکمرانوں کی حکومت میں زندگی گزار رہے ہیں، ان کے لیے نہ تو کوئی خلافت اسلامیہ ہے نہ ہی امارت اسلامیہ اور نہ ہی ان کے لیے کوئی امیر مسلم ہے جس کے تحت وہ شرعی قوانین کی روشنی میں زندگی بسر کریں اور شریعت کی طرف سے مسلمانوں کو اس طرح زندگی گزارنے کی اجازت نہیں ہے لہٰذا ایک امارت اسلامیہ اور خلافت اسلامیہ کی اقامت کے لیے اس کے مخالف حکمرانوں کے خلاف جہاد کرنا مسلمانوں پر واجب ہے۔

ایک دارالاسلام کے دارالحرب ہو جانے کے بعد اس کو واپس دارالاسلام کی حیثیت دلانا ایک مستقل فریضہ ہے۔ دارالاسلام کے حکمران کے کفر بواح کے مرتکب ہونے کے بعد اس کو ہٹا کر مسلم امام کو حاکم بنانا ایک مستقل فریضہ ہے، اسی طرح کسی خطۂ زمین میں اگر حکم الٰہی کا نفاذ نہیں ہے تو حکم الٰہی کا نفاذ اور خلافت اسلامیہ اور امارت اسلامیہ کی اقامت ایک مستقل فریضہ ہے۔

ان تینوں باتوں میں کسی کو اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔ لہٰذا برِّصغیر کے حکمرانوں کے خلاف جہاد کرنا مسلمانوں پر واجب ہے چاہے وہ حکمران بھارت کے ہوں، پاکستان کے یا بنگلہ دیش کے۔

ایک مرتبہ پھر نظر ڈالیں

۱. برِّصغیر کے یہ تینوں ملک، چوں کہ دار الاسلام سے دار الحرب بنے اور اب تک دار الاسلام کی طرف نہیں لوٹے، لہٰذا اس کو دار الاسلام کی طرف لوٹانا مسلمانوں پر فرض ذمہ داری ہے، اس میں رکاوٹ پیدا کرنے والا اپنے کو مسلمان ظاہر کرتا ہو یا کافر اس کا مقابلہ کرنا اور اس کے خلاف جہاد کرنا فرض ہے۔

۲. برِّصغیر کے بعض خطوں کے حکمران کافر معلن ہیں اور بعض حکمران کفر بواح میں مبتلا ہیں، ہر صورت میں کافر حکمرانوں کو ہٹا کر مسلمانوں کے حاکم کے طور پر کسی مسلم حکمران کو تختِ حکومت پر لانا مسلمانوں پر فرض ہے، اس کے لیے جہاد کے بغیر کوئی چارہ نہیں، لہٰذا اس فرض کو ادا کرنے میں جو بھی رکاوٹ ڈالے گا اس کے خلاف جہاد کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔

۳. مسلمانوں کی اجتماعی زندگی شرعی قانون اور قرآن وحدیث کے قوانین کے ماتحت چلنا فرض ہے، جہاں یہ قرآنی قوانین کی ماتحتی نہیں ہے، وہاں قرآنی قوانین کی اقامت یعنی خلافت اسلامیہ اور امارت اسلامیہ کی اقامت مسلمانوں پر ایک فرض ذمہ داری ہے، اس فرض ذمہ داری کو ادا کرنے میں جو بھی رکاوٹ ڈالے گا اس کے خلاف جہاد کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔

اس مسئلے میں مشتبہ ہونا اور مشتبہ کرنا نامناسب ہے۔ بلکہ شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کی روحانی اولاد سیّد احمد بریلوی شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کے وارثین، اکابر و اسلام کے مقتدائے امت افراد کے لیے مناسب ہے اور وقت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسئلہ کو واضح طور پر امت کے سامنے پیش کریں۔ یہ شرعی ذمہ داری ہے، علمی امانت ہے اور سلف کی صحیح اقتدا ہے۔

مسئلے کی تحقیق کرتے وقت اور امت کے سامنے اس کی شرعی حیثیت پیش کرتے وقت مسئلہ پر عمل کرنے کی دشواریاں، حالات کی نزاکت وغیرہ غیر اہم ہیں اور اظہار حق میں اسے مانع نہ بننا چاہیے۔ مسئلہ کی تحقیق کے وقت دلیل اور استدلال کا درست ہونا مطلوب ہے، استنتاج کی صحت مطلوب ہے، امانت داری مطلوب ہے، تحریف نہ ہونا مطلوب ہے، ان امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی رعایت کر کے مسئلہ کی صورت حال صاف صاف زبان میں بتلا دینا ہی شرعی ذمہ داری ہے۔

یہ ہے علمی ذمہ داری جس کو ادا کرنا ہم نے ضروری سمجھا، اس علمی دستر خوان پہ علمائے کرام اور مفتیان عظام کو ہم خوش آمدید کہتے ہیں۔ مسئلے کی شرعی حیثیت امت کے سامنے واضح ہو جائے تو اس کے بروئے کار کی صورت بھی نکل آئے گی، ان شاء اللہ۔ مسئلہ کی تحقیق اور اعلان اگر نہ ہو تو عمل کا داعیہ ہی پیدا نہ ہو گا اور ادائے فرض کی تڑپ بھی مفقود رہے گی۔

مسئلے کی وضاحت کے بعد جس کو عمل کی مرتب صورت مل جائے اسے اس میں شریک ہونا چاہیے اور اسے اپنے لیے اللہ کی جانب سے سعادت سمجھنا چاہیے اور جس کو مرتب صورت نہ ملے وہ اس کی تلاش میں لگا رہے اور تب تک حسب استطاعت اعداد کے مراحل طے کرتا رہے تاکہ شرعی مسئولیت سے اور اللہ کی جانب سے مواخذ سے بچ پائے۔

جہاد ایک اجتماعی عمل

یاد رہے کہ جہاد ایک اجتماعی عمل ہے، انفرادی طور پر یہ ذمہ داری ادا نہیں کی جاسکتی لہٰذا یا تو ہم جہاد کی کسی اجتماعی سرگرمی کے ساتھ لاحق ہو جائیں اور اگر معتمد علیہ کوئی اجتماعی کیفیت نہ ملے تو اپنے حوصلے کے مطابق کوئی اجتماعی کیفیت تشکیل دینے میں اپنی تمام تر کوششیں صرف کریں۔ ایک امر لابدی اور ایک حتمی فرض ذمہ داری کو بجالانے کے لیے ایک مکلف مسلمان کو جو جو کرنا چاہیے وہ سب کریں، انفرادی تیاری جاری رکھیں اور اجتماعی جہاد کی ہر ممکنہ صورت بروئے کار لانے کی کوشش کرتے رہیں۔ تلاش کی تڑپ ایسی ہونی چاہیے جو اس تائب بندے کی تھی جس نے

ننانوے قتل کرنے کے بعد توبہ کی راہ تلاشنی چاہی اور اجتماعی قوت تشکیل دینے کی جہد ایسی ہونی چاہیے جو تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں نظر آتی رہی۔ اسلامی خلافت اور اسلامی امارت نے دشمنوں کے ہاتھوں پامال ہونے کے بعد جس طرح دوبارہ سر اٹھایا ہمیں بھی اسی راستے پر چلنا ہو گا۔ اس مقصد کے لیے ماضی بعید میں تاتاریوں کے خلاف مسلمانوں کی کامیاب لڑائی اور ماضی قریب میں روس کے خلاف اور اب امریکی سامراج کے خلاف افغان مجاہدین کے جہاد کو اسوہ کے طور پر سامنے رکھ سکتے ہیں اور موجودہ حکومتوں سے بے زاری اور برأت اس طرح ہونی چاہیے جیسے اصحاب کہف نے اپنے دور کے حکمرانوں سے کی تھی۔

ہماری کمزوری اور عذر

ہماری کمزوری یہ ہے کہ امت کی اکثریت عرصے سے اس ذمہ داری سے غافل ہے اور اس غفلت کی وجہ سے جو کمزوریاں پیدا ہوئیں ان کا پیدا ہونا لابدی تھا، ایک کمزوری فرضیت جہاد کے مسئلے کا واضح نہ ہونا ہے اور دوسرا ایک کامیاب جہاد کا نقشہ اور کیفیت نگاہوں سے اوجھل ہو جانا ہے۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ جس مسئلہ کی تمرین نہیں ہو گی اور جس کا کوئی عملی نمونہ سامنے نہ ہو گا اس کی شرعی حیثیت سے مسلمان غافل ہوتے چلے جائیں گے اور یہی ہوا۔

مزید برآں عالمی طور پر دشمنان اسلام کی طرف سے جہاد کے خلاف پروپیگنڈہ اس پیمانے پر پھیلایا گیا ہے کہ مسلمان اپنے فریضۂ جہاد کے بارے میں شکوک و شبہات میں پڑ گئے، اسی طرح جہاد و اہل جہاد کو اس قدر بدنام کیا گیا کہ مسلمان اس فرض کی ادائیگی کو فتنہ اور فساد سمجھنے لگے نتیجتاً جہاد کی کسی ممکنہ صورت کا تصور بھی ان کے لیے محال ہو گیا۔

اس قدر نامساعد حالات میں اس مسئلے کی حقیقت اور شدت کو واضح کرنا، فرضیتِ جہاد کا اعلان عام مسلمانوں کے سامنے کرنا، اس کی عملی تطبیق کے لیے فکر مند ہونا، اور اس کو عملاً نافذ کرنے کے لیے کوشش کرنا وقت کے رہبروں کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

لٰہذا اب ہمیں اپنی کمزوریوں اور اعذار کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھنا ہو گا، خیالی کمزوریاں، تصوراتی عذر اور نباء فاسق کی بناپر فریضۂ جہاد سے دور رہنا اور مسئلے کی شرعی حیثیت واضح کرنے سے بچنا جائز نہیں ہے۔ جو مرد مجاہد اس میدان میں قربانیاں دے رہے ہیں ان کے ساتھ ہمارا برتاؤ کیسا ہونا چاہیے، یہ آج کی دنیا کا اہم ترین مسئلہ ہے۔

یاد رہنا چاہیے کہ جس طرح یہ بات صحیح ہے کہ جب تک جہاد کے لیے مناسب تیاری فراہم نہ ہو اور دشمن سے مقابلے کے لیے جو قوت درکار ہے وہ بہم نہ پہنچائی جائے تب تک کھلے میدان میں دشمن کے ساتھ لڑائی میں اترنا مناسب نہیں، اسی طرح یہ بات بھی صحیح ہے کہ ضعف و کمزوری کا عذر پیش کر کے فرض کی ادائیگی سے بے فکر ہو جانا، کسی جماعت کی تلاش یا کسی جماعت کی تشکیل کی سرے سے کوشش ہی نہ کرنا، انفرادی طور پر جو اور جتنی تیاری کی جاسکتی ہے اس کی طرف توجہ نہ کرنا، مجاہدین کی اعانت سے بے نیازی بھی جائز نہیں۔ اس قسم کا کوئی بھی رویہ اختیار کرنا درست نہیں جس کی وجہ سے مجاہدین کی جہادی سرگرمیوں میں خلل واقع ہو۔

اللہ رب العالمین ہمیں اپنے دین کی خاطر جہاد فی سبیل اللہ میں اپنا حصہ ڈالنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

وصلى الله على خير خلقه محمد وآله واصحابه اجمعين!

تمت ولله الحمد

☆☆☆☆☆

’’جہاد ایک اجتماعی عمل ہے، انفرادی طور پر یہ ذمہ داری ادا نہیں کی جا سکتی لہٰذا یا تو ہم جہاد کی کسی اجتماعی سرگرمی کے ساتھ لاحق ہو جائیں اور اگر معتمد علیہ کوئی اجتماعی کیفیت نہ ملے تو اپنے حوصلے کے مطابق کوئی اجتماعی کیفیت تشکیل دینے میں اپنی تمام تر کوششیں صرف کریں۔ ایک امر لابدی اور ایک حتمی فرض ذمہ داری کو بجا لانے کے لیے ایک مکلف مسلمان کو جو جو کرنا چاہیے وہ سب کریں، انفرادی تیاری جاری رکھیں اور اجتماعی جہاد کی ہر ممکنہ صورت بروئے کار لانے کی کوشش کرتے رہیں۔ تلاش کی تڑپ ایسی ہونی چاہیے جو اس تائب بندے کی تھی جس نے ننانوے قتل کرنے کے بعد توبہ کی راہ تلاشنی چاہی اور اجتماعی قوت تشکیل دینے کی جہد ایسی ہونی چاہیے جو تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں نظر آتی رہی۔ اسلامی خلافت اور اسلامی امارت نے دشمنوں کے ہاتھوں پامال ہونے کے بعد جس طرح دوبارہ سر اٹھایا ہمیں بھی اسی راستے پر چلنا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے ماضی بعید میں تاتاریوں کے خلاف مسلمانوں کی کامیاب لڑائی اور ماضی قریب میں روس کے خلاف اور اب امریکی سامراج کے خلاف افغان مجاہدین کے جہاد کو اسوہ کے طور پر سامنے رکھ سکتے ہیں اور موجودہ حکومتوں سے بے زاری اور برأت اس طرح ہونی چاہیے جیسے اصحاب کہف نے اپنے دور کے حکمرانوں سے کی تھی۔‘‘

نوائے غزوۂ ہند
مطبوعات